خوابوں کے ٹانکے

کرن کاشمیری

خوابوں کے قافلے

خوابوں کے قافلے

کرن کمار شمیری

ملنے کا پتہ

سیمانت پرکاشن
922- کوچہ روہیلا خاں
دریا گنج - نئی دہلی 110002

خوابوں کے قافلے

سمیرن ہاشمیری

ملنے کا پتہ

سیمانت پرکاشن
922 - کوچہ روہیلا خاں
دریا گنج - نئی دہلی 110002

قیمت ـــــــــ پندرہ روپے
ناشر ـــــــــ راج محل پبلشرز
۱۲/۵۶ - راجندر نگر - نئی دہلی
تاریخ طباعت ـــــــــ ۱۹۸۰ء
مطبوعہ ـــــــــ سود لیتھو پریس - دہلی

والدِ محترم کے نام ـــــــــ

....

آج بھی یاد ہے

وہ دن کہ انھی ہاتھوں سے

گلشنِ دہر سے توڑا تھا گُلِ تر میں نے

میں نے سوچا تھا کہ دامن میں سمیٹوں گا اسے

کتنے ارمان لیئے دل میں جگہ دینے کو

اپنے معصوم خیالوں کی حسیں وادی میں

اپنی بے لوث محبت کی جواں جنّت میں

میں نے سوچا تھا سجاؤں گا اسے سینے پر

آج بھی یاد ہے

وہ دن کہ.......

(اپنی طویل نظم کا ایک حصّہ)

وہی پُرانی سڑک تھی

وہی پُرانے جنگل تھے۔

وہی پُرانا راجہ صاحب کا محل تھا

محل سے کچھ دور نیچے کھنڈرہیں سے گذرتا ہوا وہی پُرانا دریا تھا۔ جو اُسی طرح آہستہ

آہستہ سمٹتا پھیلتا بہہ رہا تھا۔

سب کچھ ویسا ہی تھا۔ جیسا آج سے بیس برس پہلے وہ چھوڑ گیا تھا۔ صرف اُس بتدریج بلندیوں کو چھونے کے لئے بھاگتی ہوئی سڑک کے کناروں پر کچھ نئی عمارتوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

لیکن یہ نئی عمارتیں بھی اُس کے لئے اجنبی نہ تھیں۔ کیونکہ اُس کی اپنی مانوس دھرتی کی مانوس مٹی، ریت اور چونے سے بنی ہوئی تھیں سڑک پر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔!

وہی جانے پہچانے چہرے تھے۔!

وہی جانے پہچانے لوگ تھے جن کے ساتھ اُس نے بچپن کھیلا تھا۔ لڑکپن کھیلا تھا۔ جن کے ساتھ مل کر وہ اسکول سے بھاگ جایا کرتا تھا اور کڑکتی دوپہریں دریا کے کنارے اُگی ہوئی بیریوں اور گرنوں کی جھاڑیوں سے بیر اور گرنے توڑ توڑ کر کھایا کرتا تھا۔ پھر اُس دریا میں دیر تک نہاتا، کھیلتا۔ چنچل، مضطرب لہروں کو پکڑنے کی ناکام کوشش کرنا۔ اور پھر اُکتا کر پانی کو اپنے ہمجولیوں کی طرف اُچھالنے لگتا تھا۔

وہی لوگ تھے!

وہی چہرے تھے!!

بیر اور گرنے کے وہی جھاڑ تھے۔

جانے پہچانے سے کتنے اجنبی سے تھے۔ وقت کے ہاتھوں نے اُنھیں کتنا بدل دیا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ اُنھیں آواز دے، اُنھیں پکارے۔ راہ چلتے اُن کا بازو تھام لے۔ اُنھیں جھنجھوڑ کر رکھ دے۔ بتائے کہ میں وہی ہوں، تمہارا اپنا! ـــ تمہارا شام!! تم جس کے ساتھ کھیلے ہو۔ جس کے پاس تمہارا بچپن ہے۔ تمھارے پاس جس کا بچپن ہے۔ بچپن کی معصوم حسین یادیں ہیں ـــ معصوم شوخیاں ہیں۔ وہ سب کچھ ہے جسے ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔!!

لیکن وہ کسی کو آواز نہ دے سکا۔ کسی کو نہ پکار سکا! کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ چُپ چاپ سر جُھکائے چلتا رہا۔ اُسی سڑک پر جو سیدھی راجہ صاحب کے محل اور اُس کے گرد پھیلے ہوئے جنگل تک جاتی تھی۔ اور پھر سانپ کی طرح بل کھاتی پھنکارتی پہاڑوں کے گرد لپٹتی چلی جاتی تھی۔

اس سڑک سے وہ ہزاروں بار گذرا تھا۔ بچپن میں اپنے باپ، ماں، یا چچا کی اُنگلی پکڑے۔ اُچھلتا، کودتا، مچلتا، روٹھتا، ـــ چند قدم چلتا، پھر ماں، باپ یا چچا کی گود

میں جانے کیلئے مچل اُٹھتا ـــــ اور جب کوئی بھی اُسے گود میں اُٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتا تو ہر طرف سے مایوس ہو کر پیچھے پیچھے سر جھکائے چلتے ہوئے بھولو چاچا کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھنے لگتا ـــــ اُس کی ننھی مُنی معصوم آنکھوں میں مایوسی کی جھلک دیکھتے ہی بھولو چاچا کی بوڑھی کمزور باہیں پھیل جاتیں ـــــ اُس کے جھرّیوں بھرے چہرے پر پھیلی ہوئی مونچھوں میں بڑی دل آویز تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ـــــ وہ دوڑ کر بھولو چاچا کے آغوش میں پہنچ جاتا۔ اور بھولو چاچا اُس کے ننھے ننھے گالوں سے اپنی کھچڑی داڑھی رگڑتا ہوا اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا لیتا۔

اُسے بھولو چاچا سے بے حد پیار تھا۔ اُس کی بڑی بڑی مونچھوں اور کھُردری داڑھی کے لمس سے ایک عجیب فرحت بخش سکون ملتا تھا۔ جب بھی بھولو چاچا اُس کے گالوں کے ساتھ اپنی داڑھی چھوتا، وہ اپنے تمام دُکھ بھول جاتا۔ رونا بھول جاتا۔ اور ایک دم مسکرانے لگتا۔

شام نے جب سے ہوش سنبھالا، بھولو چاچا کو اسی طرح، اسی حالت میں دیکھا تھا۔ وہی جھُرّیوں بھرا چہرہ۔ وہی کھُردری کھچڑی داڑھی۔ اور وہی گل مچھے! وہ اس عمر میں بھی خاصا تندرست تھا۔ اس عمر میں بھی اُس کی کاٹھی کافی مضبوط تھی؛ اسوقت جیسے اُس میں کوئی نئی تبدیلی پیدا ہی نہیں کر سکا تھا۔ اُس کے سخت ہاتھ بھی جیسے بھولو چاچا میں کوئی تبدیلی لانے سے قاصر تھے۔

بھولو چاچا کب سے اُن کے ہاں تھا؟ یہ شاید کسی کو بھی یاد نہیں رہا تھا۔ خود شام کے والد بھی اُسے بھولو چاچا ہی کہتے تھے۔ وہ چھوٹے بڑے سب کا چاچا تھا۔ سارے محلے کے لوگوں کا چاچا ـــــ! جب وہ گھر کا کام کاج ختم کر کے اپنی چھوٹی سی جھاری لئے صحن کے درد آبے میں آ بیٹھتا تو محلے کے تمام بچے اُس کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور اُس سے کہانیاں سُنتے ـــــ!

بچوں میں گھرا ہوا جھاری گڑگڑاتے ہوئے کہانیاں سُناتا۔ بھولو چاچا کسی بوڑھے برگد کی طرح

دکھائی دیتا تھا۔ جس کے سائے میں بہت سے تھکے ہارے راہگیر دوپہر کی گرمی سے بچنے کے لئے آ بیٹھتے ہوں۔

بھولو چاچا کے سائے میں بھی نہ جانے کتنے ہی لوگ بیٹھ چکے تھے۔ نہ جانے کتنے ہی بچے اُس کی کہانیاں سُن سُن کر کئی کئی بچوں کے والدین بن چکے تھے۔ مگر بھولو چاچا کی کہانیاں ختم ہونے میں نہیں آئی تھیں ـــ کہانیاں جو اُس کی اپنی ذات سے منسوب تھیں۔ اُس کے کھیتوں، اُس کے گاؤں سے منسلک تھیں۔ گاؤں کے لوگوں سے متعلق تھیں۔ جو ہر بار نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد اُس کی اپنی ذات سے آملتی تھیں۔ رکھ کے قصّے تھے، ـــ راجہ صاحب کی رکھ میں ملنے والے شکار کے قصّے تھے شکاریوں کی کہانیاں تھیں۔ بھولو چاچا کبھی زمانے میں فوج میں بھی رہ چکا تھا۔ اور آج تک ہر ماہ پنشن کے سات روپے لینے خزانہ میں جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی فوجی زندگی کے قصّے بڑے جوش کے ساتھ سُنایا کرتا تھا۔ اور اُس وقت یوں محسوس ہوتا جیسے سُننے والے اُس کے معرکوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ خود بھولو چاچا بھی جیسے اُس وقت کئی سال پیچھے چلا جاتا اور اسکے چہرے سے بڑھاپے کے تمام نقوش لمحہ بھر کیلئے غائب ہو جاتے۔

بھولو چاچا بھی ایک سڑک تھا ـــ بہت پُرانی سڑک ـــ! راجہ صاحب کے محل کی طرف جانے والی اِس سڑک کی طرح اُس کے سینے میں بھی بے شمار کہانیاں دفن تھیں ـــ بے شمار قدموں کے نشان تھے۔

شام کا سارا لڑکپن اِسی ٹیڑھی میڑھی سڑک اور اُس کے گرد پھیلے ہوئے انہی جنگلوں اور نیچے گہرائی میں بہتے ہوئے اِسی دریا کے کنارے ہی گزرا تھا معصوم اور البڑ لڑکپن ـــ شوخ عمر! صرف راستے کے ساتھی بدل گئے تھے۔ ماں باپ اور چچاؤں کی جگہ ہمجولیوں اور دوستوں نے لے لی تھی۔ اس سڑک کے فراخ سینے میں، اُس کی کتنی کہانیاں سو رہی تھیں اُس کا بچپن سو رہا تھا ـــ اُس کا لڑکپن سو رہا تھا۔ لڑکپن کی کھلواڑیں سو رہی تھیں ـــ دوستوں کے ساتھ لڑائی جھگڑوں، روٹھنے منانے کا ایک لامتناہی سلسلہ سو رہا تھا۔ اور اسی میں

اس کی پہلی محبت ۔ لڑکپن کی پہلی چاہت اور بے لوث لگاؤ کی ابدی داستان سو رہی تھی ۔
واقعی سڑک ایک کتاب ہے۔ جس پر قدموں کے نشان حروف کی شکل میں اُبھر کر ایک غیر مختتم کہانی کے خد و خال واضح کرتے رہتے ہیں ۔
یہ سڑک ان گنت کہانیوں کو سمیٹے ہوئے بھی خاموش تھی ! اُس کی اپنی محبت کی طرح ۔
اُس کے سینے پر سے ہر روز لاتعداد بھاری بھرکم ٹرک ۔ سواریوں سے بھری ہوئی بسیں اور خوبصورت سڈول کاریں چیختی، چنگھاڑتی، تیرتی ہوتی ہوئی گذرتی تھیں ۔ اُسے لتاڑتی تھیں کہ اُن کہانیوں سے اُنھیں بھی روشناس کرا دے ــــ اِس بیش بہا سرمایہ میں سے اُنھیں بھی حِصّہ دے ــــ
لیکن وہ کسی اگلے وقتوں کے ایماندار شخص کی طرح اِن سب کہانیوں، اِن سب امانتوں کو سنبھالے ہوئے تھی ۔ اُمید لگائے ہوئے تھی ۔ کہ کسی نہ کسی روز کبھی نہ کبھی ان کہانیوں کے وارث، اُن کے جنم داتا اُن کے پاس آئیں گے ــــ
شام کے قدم اپنے سنگین سینے پر محسوس کرتے ہی اسی دیرینہ امین نے اُس کی امانت اُسے سونپ دی ۔ اُس کی پہلی خاموش محبت کی تمام یادیں خاموشی سے اُس کی جھولی میں ڈال دیں ۔
سڑک پر لاتعداد لوگ آجا رہے تھے بے شمار فوجی . . . اور سویلین ٹرک چل رہے تھے ۔ ان گنت بسیں سواریوں اور اُن کے سامان سے دبی ہوئی تھکی تھکی سی رفتار سے رینگ رہی تھیں کہ میدانوں کی جھلستی ہوئی گرمی سے بچا کر اِن سواریوں کو خنک، خوشگوار اور حسین وادیوں میں پہنچا دیں تاکہ انھیں گرمی نہ لگے ۔ لو سے بچ جائیں ۔ کیوں کہ وہ اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ گرمیوں میں پہاڑوں کی راحت بخش خنکیوں میں دادِ عیش دیں اور سردیوں میں پھر میدانوں میں لوٹ جائیں تاکہ انھیں سردی نہ لگ جائے ۔ یہ لوگ نہ سردی برداشت کر سکتے ہیں نہ گرمی ــــ اور سردی گرمی انسانوں کیلئے ہے ــــ کتنی عجیب سی بے ڈھنگی مخلوق ہے ۔ ــــ لیکن خدا کے کتنی قریب ــــ !!
کاش کہ . . . ؟؟ بہر حال :
بھری پُری جلتی ہوئی سڑک پر ایک کہانی خاموشی سے اپنے خالق کے پاس لوٹ آئی ۔

کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی — شام نے بوجھل دل سے اس کہانی کو سمیٹا — اپنے دل کی عمیق گہرائیوں میں چھپالیا — اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ پرانی یادوں کو سمیٹنے کی مسرت سے ؟ — یا اُن یادوں کی اذیت ناک خاموشیوں کی وجہ سے ؟؟ — وہ بوجھل دل سے بوجھل قدموں کے ساتھ اُس سڑک پر چلنے لگا۔

بیس برس بعد — !

بیس برس پہلے — !!

بیس برس تک وہ اپنے شہر اپنی مٹی سے دور رہا تھا۔ اپنی متلاطم زندگی کے سکون کے لئے ! — اب تو بیلا بھی یہاں نہ تھی۔ اُسے بھی یہ شہر چھوڑے ہوئے برسوں گذر گئے تھے۔ وہ یہاں سے سینکڑوں میل دور راجدھانی میں تھی۔ جہاں اُس کا باپ تھا۔ اوباش آوارہ شوہر تھا۔ اُس کے بچے تھے — وہ یہ سب جانتا تھا۔ خود بھی اب اپنی سیمابی طبیعت سے اُکتا چکا تھا، پُرسکون زندگی گذارنا چاہتا تھا — وہ نہیں چاہتا تھا کہ ماضی کی بھولی بسری یادوں کو کریدے — لیکن یہ سڑک نہ جانے کہاں سے آ گئی تھی ؛ — اُس کی برسوں پرانی زندگی کے ورق اُس کی جھولی میں ڈال رہی تھی۔ جن میں وہ سب کچھ تھا جسے وہ بھولنا چاہتا تھا — بھولنے کی کوشش کر رہا تھا

شام جانتا تھا کہ محبت اور نفرت ایک ساتھ نہیں چل سکتیں — امرت اور زہر کبھی اکٹھے نہیں رہ سکتے ! — اِن کا ملاپ کبھی نہیں ہوتا، — دونوں میں کسی قسم کا سمجھوتہ ہونا ناممکن ہے لیکن پھر بھی ماضی کی تلخی آمیز شیریں یادیں ایک پھانس کی طرح اُس کے سینے میں اٹک کر رہ گئی تھیں۔

اُس نے چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ تاکہ اُس کے اندر جاگنے والا طوفان کچھ ہلکا ہو جائے — مگر آواز جیسے اُس کے گلے میں گھُٹ کر رہ گئی تھی — وہ دونوں ہاتھوں سے پیشانی کو تھامے اُسی سڑک کے کنارے بنی ہوئی دیوار پر بیٹھ گیا !! —

شام نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، جس ماحول میں پرورش پائی تھی وہ ایک اُجڑتے بکھرتے ہوئے نظام کی آخری ہچکیاں تھیں۔ آباء و اجداد بڑی بڑی زمینیں، جائیدادیں اور جاگیریں چھوڑ کر مرے تھے۔ جو انہیں وقتاً فوقتاً اعلیٰ کارکردگیوں کے صلہ میں ملی تھیں۔ حکومت ورثہ میں ملتی تھی۔ اپنے علاقہ، اپنی جاگیر کے حاکم بلکہ خدا ہوتے تھے۔ لیکن اب وقت بدل گیا تھا ــــ زمینیں، جائیدادیں، جاگیریں، سب ظاہری آن بان کی نذر ہو چکی تھیں، یا ایک پیڑھی سے دوسری پیڑھی میں منتقل ہوتے ہوتے بٹ گئی تھیں۔ رہی سہی کسر نئے دور کے نئے انسان نے پوری کر دی جو جاہ و حشمت کا قائل نہیں تھا، جو ورثہ کا قائل نہیں تھا ــــ جو صرف یہ جانتا تھا کہ زمین اُسکی ہے جو اس میں ہل چلاتا ہے ــــ اُس کے سینے کو چیر کر اناج کے سرسبز کھیتوں کو جنم دیتا ہے۔

شام کے والد تعلیم یافتہ تھے۔ نئی روشنی کے پروردہ تھے۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھتے تھے۔ وقت کا ساتھ دینا بھی جانتے تھے۔ انھوں نے اپنی بچی کھچی زمین خود ہی کاشتکاروں کے حوالہ کر دی تھی۔ اور اب کچھ بھی باقی نہ تھا۔ زمینیں جائیداد ختم ہو چکی تھی۔ پرانی شان و شوکت بزرگوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی تھی لیکن حکومت کی بو ابھی تک نہیں گئی تھی۔ ویسے رسی جل جاتی تھی لیکن بل قائم رہتا تھا۔ کاشتکار مزارعے تو اب تھے نہیں جو اُن کے ہر حکم پر لبیک کہتے۔ اس لئے ایک اسکول قائم کر لیا گیا۔ حکومت کا شوق اب اس چھوٹی سی ریاست سے پورا کرتے تھے۔ اور اسی کی آمدنی پر گذارہ!

شام نے جب ہوش سنبھالا تو زرین دور کے تمام دھاگے ٹوٹ چکے تھے۔ صرف کہانیاں رہ گئی تھیں، جو گھر کی بڑی بوڑھیاں اپنے دن کاٹنے اور اپنے دور کی یاد تازہ کرنے کیلئے دوہراتی رہتی تھیں۔ اور ان کہانیوں کو دوہراتے وقت ان کی صداقت کے ثبوت کے لئے بھولو چاچا کا سہارا لیا جاتا تھا جس نے وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پرانے دنوں کی بھولی بسری

یادیں تازہ کرتے وقت اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ـــــ تمام نقوش مٹ چکے تھے ـــ مٹ رہے تھے! ـــــ اب اُن کا گھرانہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اس لئے شام کو اپنے متعلق کسی قسم کی خوش فہمی نہ تھی۔ اُس کو معلوم ہوچکا تھا کہ زندہ رہنے کے لئے اُسے باپ دادا کی کمائی نہیں ملے گی۔ بلکہ اپنے بازوؤں پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اُسے معلوم تھا کہ نام کے ساتھ تین چار خاندانی القاب جوڑنے کے باوجود اُس کا باپ صرف ایک ماسٹر تھا۔ کوئی بڑا سرکاری افسر یا زمیندار نہیں! ـــــ اسی لئے اُسے سنبھلنے میں دِقّت نہیں ہوئی ـــــ اب وہ ایک اچھے عہدے پر تھا۔ اچھی تنخواہ پاتا تھا ـــــ عزت تھی، رسوخ تھا ـــــ سب کچھ تھا ـــــ لیکن نہ ملا تو سکون ـ!

اُس کا دل اب بھی اسی طرح مضطرب تھا۔ اُس کی محبت آج بھی اسی طرح اُجڑی اُجڑی ...... ویران ویران سی تھی! ـــــ بیلا کی نفرت اُسی طرح قائم تھی ـــــ دونوں میں اب بھی وہی خلیج حائل تھی۔ نفرت کی ایک بلند دیوار تھی جو بیلا نے خود تعمیر کی تھی۔ اُس کی بے لوث محبت بھی اس دیوار کو نہیں توڑ سکی ـــــ اس خلیج کو نہیں پھاند سکی۔! ـــــ خود بیلا بھی اپنی بنائی ہوئی اس دیوار کو نہیں پھاند سکی تھی ـــــ انسان کتنا بے بس ہوجاتا ہے! ـــــ انسان کتنا مجبور ہے؛ قدرت کے سامنے بھی اور اپنی ذات کے سامنے بھی۔!!

●●●

بیلا اُس کی پہلی محبت تھی۔ اُس کا پہلا معبود تھی۔ جسے وہ لاکھ کوشش پر بھی فراموش نہیں کر سکا تھا۔ وہ دن آج بھی اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ جب بیلا اُس سے پہلے پہل ملی تھی۔ جیسے یہ سب آج ہی کی بات ہو۔ ابھی ابھی چند لمحے پہلے گذری ہو۔

اُس کے والد اپنے اسکول کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سامنے کرسی پر ایک گورا چٹّا بھرے بھرے جسم والا شخص بیٹھا اُن سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی ننھی مُنّی سی سُرخ و سپید گڑیا۔ سفید فراک میں ملبوس اُکھڑی اُکھڑی سی کھڑی تھی۔ کُرسی کے بازو سے لگی ہوئی اُس گورے چٹے شخص کے کوٹ کی آستین سے اُلجھ رہی تھی۔

ایک ننھی سی پری! ——

کسی دور دیس کی شہزادی! —— جو ہمیشہ دادی اماں کی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں سے آ ٹپکتی تھی۔ اور پھر جب سب سو جاتے تو کسی نامعلوم ستارے سے اُتر کر ساری ساری رات اُس کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔ لیکن صبح جب اُس کی آنکھ کُھلتی تو نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی؟؟ ——

اپنے باپ کے کمرے میں اس ننھی سی پری کو دیکھ کر وہ ٹھٹک سا گیا تھا۔ روز کی طرح آج بھی وہ آدھی چھٹی کے وقت چاٹ وغیرہ کھانے کیلئے پیسے لینے آیا تھا۔ مگر اب وہ جیسے بھول ہی گیا تھا کہ اُسے کیا کرنا ہے؛ اُس کے والد نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ایک سکّہ نکال کر اُسے دیا اور پھر اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔ لیکن وہ اسی طرح اُن کی کرسی سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ اپنی شہزادی کو دیکھتا رہا۔

لڑکی کا باپ داخلہ کا فارم بھر رہا تھا۔ لڑکی اب اُس کی آستین کو چھوڑ کر اُس کی طرف دیکھنے لگی تھی ــــ اُس کے باپ نے فارم بھرا اور بولا۔

"کتنے روپے دوں؟"

شام کے والد کچھ دیر تک ایک کاغذ پر کچھ حساب کرتے رہے۔ پھر بولے۔

"پندرہ روپئے! دس روپے فیس، دو روپئے داخلہ۔ ایک روپیہ ...."

لڑکی کے باپ نے جھٹ بٹوہ نکالا۔ اور روپئے گننے لگا۔ شام کے جی میں نہ جانے کیا سمائی، اُس نے اپنے والد کے گلے میں باہیں ڈال دیں ــــ

"پاپا ــــ!"

لیکن پاپا اُس کی پری کے باپ کے پرس سے نکلنے والے نوٹوں کو دیکھ رہے تھے۔

"پاپا ــــ!!" اُس نے پھر بلند آواز سے پکارا۔

"جاؤ کھیلو ــــ! اور پیسے نہیں ملیں گے!"

اُنھوں نے پیار سے ڈانٹا۔

"ایک بات ــــ!"

"کیا ہے ــــ؟" اُس کے پاپا نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"پاپا! ان سے پیسے نہ لو!"

ننھی سی پری کی آنکھوں میں نہ جانے کہاں ــــ اتنی سختی آ گئی ــــ وہ ایک دم

بول پڑی۔

"کیوں نہیں لیں گے پیسے؟ کیا ہم غریب ہیں؟؟ ہم نہیں پڑھتے مُفت میں!"

اُس کی نگاہوں میں غصہ تھا ___ نفرت تھی! ___ بے اندازہ نفرت ___ جیسے کسی نے اُسے بڑی نامناسب بات کہہ دی ہو۔ بہت بڑی گالی دے دی ہو ___ شام ایک دم ٹھٹک سا گیا۔ حیران سا ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب اور لڑکی کا باپ دونوں اُن کی باتوں پر ہنسنے لگے تھے۔

شام اپنی خوابوں کی شہزادی کو بڑی سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ اجنبی اجنبی سی نظروں سے ___ لیکن یہ اجنبیت کی دیوار زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی ___ بچپن کی اجنبیت تھی نا..... کب تک قائم رہتی..؟

شام نے آگے بڑھ کر اپنی اس پری کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ لڑکی خاموشی سے اُس کے ساتھ جا رہی تھی۔ وہ اُسے گھسیٹتا ہوا اپنی جماعت کے کمرے میں لے آیا۔ اپنا بستہ کھول کر اُسے اپنی کاپیاں دکھائیں ___ اپنی تصویروں والی کتابیں دکھائیں نیکر کے پھٹے ہوئے جیب میں سے ماچس کی ایک ڈبیا نکال کر دکھائی جس میں اُس کی بے شمار دولت بھری پڑی تھی۔ کانچ کی گولیاں تھیں۔ ایک بلیڈ تھا۔ کانچ کی چوڑیوں کے چند رنگ برنگے ٹکڑے تھے۔ دوسری جیب میں بھی اسی طرح کی کئی دلچسپ چیزیں۔ لٹّو۔ ڈوری چاک۔ سلیٹی کے ٹکڑے ___ رنگدار چاکوں کے ٹکڑے ___ اور نہ جانے کیا کیا نکال کر اُس کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

وہ اُکتائی اُکتائی سی نظروں سے ہر چیز کو دیکھتی رہی۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی گھُل مل گئی ___ بچپن کی عمر تھی ___ بے لوث معصوم رشتے تھے جو بغیر کوشش کے ہی مل جاتے ہیں! اونچ نیچ، امیری غریبی کی دیواریں اُن کے درمیان زیادہ دیر تک نہیں کھڑی رہتیں۔

اس عمر میں کسی قسم کا تصنع، کسی قسم کی بناوٹ قائم نہیں رہتی ـــــ سیدھی سادی بے لاگ سی لگاوٹ ہوتی ہے جو کسی تعارف کی محتاج نہیں ہوتی۔ بچپن خود ہر قسم کی بندشوں کو توڑ کر بچپن سے متعارف ہو جاتا ہے۔ اس میں بے گانگی کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ہمارے بنائے ہوئے سماج اور اُس کے خود ساختہ قوانین سے نبدش سے دور ہوتا ہے وہ صرف قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں کا پابند ہوتا ہے اور قدرت صرف محبت سکھاتی ہے محبت! جو صرف دنیا جانتی ہے!

"میرا نام شام ہے ـــ!"

"میرا نام بیلا ہے!"

دونوں دیر تک یونہی کھیلتے رہے۔ اجنبیت کا احساس اب مٹ چکا تھا جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ برسوں سے ایک ساتھ ہی رہتے تھے۔ شام کو معلوم ہی نہ ہوا کہ کب آدھی چھٹی ختم ہوئی؟ کب اُستانی کلاس میں آئیں اور کب انگریزی کی ایک نظم رٹا کر چلی گئیں؟ وہ اپنی باتوں میں لگے رہے ـــ اپنے اپنے گھر کی باتیں ـــ بہن بھائیوں کی باتیں ـــ! چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں، چھوٹے چھوٹے قصے تھے۔ جو پھر پھر کر اُن کی اپنی چھوٹی سی دُنیا کے گرد ہی منڈلاتے رہتے تھے ـــ اُن کی اپنی چھوٹی سی ذات سے ہی وابستہ تھے۔

بیلا نے اُس کی چیزیں دیکھیں ـــ! اُس کے کپڑے دیکھے اور بولی۔

"تمھارے کپڑے کیسے ہیں؟ اپنے پاپا سے کیوں نہیں کہتے کہ اچھے اچھے کپڑے لا کر دیں۔"

شام جھٹ سے بولا۔

"کیوں؟ اچھے بھلے تو ہیں! اتنے صاف ستھرے ہیں!!"

مگر بیلا کو اُس کی کوئی چیز بھی پسند نہیں تھی۔

"یہ بھی کوئی کپڑے ہیں! ہمارے گھر آنا۔ تمہیں اپنے کپڑے اور کھلونے دکھاؤں گی!"

شام نے جھٹ اپنی جیب سے اپنا رنگین لٹو نکالا۔ اور اپنی ہتھیلی پر نچاتے ہوئے بولا
"ایسا لٹو ہے تمہارے پاس؟"
بیلا نے ایک نظر لٹو پر ڈالی اور کھکھلا کر ہنس پڑی۔
"یہ لٹو ہے ۔۔۔؟" وہ پھر ہنسنے لگی۔ "میں اِن لکڑی کے لٹوؤں سے نہیں کھیلتی۔
میرے پاس چابی والا لٹو ہے ۔۔۔ میرے گھر آنا ۔۔۔ تمھیں دکھاؤں گی۔ میرے پاس
تو ڈھیر سارے کھلونے ہیں! اچھے اچھے!! تم نے تو کبھی دیکھے بھی نہ ہوں گے۔"
بیلا کی باتوں میں ایک تکبر، ایک خود ستائی تھی، شام اُس کے قریب ہوتے
ہوئے بھی ایک دوری سی محسوس کر رہا تھا! وہ اُس کا قرب چاہتا تھا۔ اُسے اپنے گھر
لے گیا۔ اپنے تمام نئے پُرانے کھلونوں کی نمائش کی۔ بڑی فراخدلی سے اُن میں سے تین چار
کھلونے چُن کر بیلا کو دئے۔ یہ کھلونے اُس کی نظروں میں بہترین تھے۔
بھولے سہانے بچپن کی بھولی بھالی محبت کی پہلی بھینٹ!!
بیلا نے اُس کے کھلونوں پر ایک نظر ڈالی ۔۔۔
"میں کیا کروں گی ان کو؟ میرے پاس ان سے اچھے کھلونے ہیں۔"
"یہ بھی لے جاؤ۔ اور بھی دوں گا ۔۔۔ بڑے خوبصورت کھلونے لا کر دوں گا۔"
شام جیسے اُسے اپنے کھلونے نہیں دے رہا تھا، اُس سے بھیک مانگ رہا تھا۔
بیلا نے کھلونے لے لئے اور اپنے گھر چلی گئی۔
دونوں کے گھر آمنے سامنے ہی تھے صرف چوڑی سی سڑک درمیان میں حائل تھی۔
ایک طرف شام کا سہما، سکڑا ہوا دو منزلہ مکان تھا، جس میں گنتی کے پانچ چھ کمرے تھے
تو دوسرے کنارے، اس مختصر سے مکان کے عین سامنے بیلا کی وسیع و عریض حویلی تھی۔
جس کی بلندیاں آسمان کو چھوتی تھیں۔ جس میں ان گنت کمرے تھے ۔۔۔ بے شمار ساز و
سامان تھا۔ بیش قیمت صوفہ سیٹ تھے۔ قیمتی قالین تھے ۔۔۔ جس کی ہر چیز قیمتی تھی۔

اُجلی تھی! ۔۔ صاف ستھری .... دھلی دُھلائی ـــــ بالکل اپنے مکینوں کی طرح، اُجلی .... بالکل بیلا کی طرح ـــ!! دونوں کا کوئی میل نہ ۔ کوئی جوڑ نہ تھا۔ !! کوئی ایسا نقطہ نہ تھا۔ جہاں یہ بلند و بالا حویلی اور اُس کا چھوٹا سا دو منزلہ مکان مل جاتے۔ حویلی کی سُرخ رنگ میں ڈوبی ہوئی دولہن کی سی دیواریں اُس کے پُرانے مکان کی شکستہ دیواروں سے مل جائیں۔

بیلا جانتی تھی کہ وہ ایک امیر گھرانے کی لڑکی ہے۔ اس عمر میں بھی اُسے اپنی دولت کا احساس تھا، اپنی امارت کا احساس تھا۔ اپنے رتبہ کو پہچانتی تھی۔ اس فرق کو جانتی تھی جو سماج دولت مند اور غیر دولت مند میں روا رکھتا ہے۔ اُس نے ہوش سنبھالتے ہی ملازموں کو حکم دینا سیکھا تھا۔ دولت نے اُسے خود سر بنا دیا تھا۔ اپنے باپ کی اونچی حویلی، نئی چمکدار کار اور انڈھے سرمایہ نے مغرور کر دیا تھا۔ کسی کو خاطر میں لانا اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس نے آج تک جو چاہا اُسے ملا۔ جو مانگا، پایا۔

اُس کی کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو تشنہ رہی ہو۔ مگر شام نے اُس کے برعکس زندگی دیکھی تھی۔ اُسے قدم قدم پر اپنے وجود کا ثبوت دینا پڑا تھا۔ ہر چیز کے لئے جد و جہد کرنی پڑتی تھی۔ حالات نے اُسے زمانہ سے ٹکرانا سکھا دیا تھا۔ اُس میں خود اعتمادی سی پیدا کر دی تھی ـــــ دونوں میں عجیب سا تضاد تھا۔ جو کہانیوں کا عنوان تو بن سکتا ہے ۔ لیکن خوش آئند زندگی کا مستقبل نہیں بن سکتا۔

●●●

یہ شہر ایک اونچے سے پہاڑی ٹیلے پر آباد تھا جس کے ایک طرف
ڈھلان میں خاموش پُر سکون دریا بہتا تھا۔ جو اپنے صاف شفاف پانیوں میں ہلکی سی شرارت
لئے ہوتا تھا۔ کبھی کبھی غصہ میں آ کر یہ سمٹا سکڑا دریا خوفناک شکل بھی اختیار کر لیتا۔ مگر اُس کے
غصہ میں بھی ایک پیار، ایک شفقت کی آمیزش ہوتی — جیسے مہربان باپ اپنے شریر بچے
کی کسی غلطی پر ناراض ہو جائے — غصہ میں آ کر اُسے ڈانٹ دے۔ اُس کی لہریں شدید
ترین غضب کی حالت میں بھی اپنا باپ ہونا نہیں بھولتی تھیں۔ جب پانی سر سے گذر جاتا تو زیادہ
سے زیادہ چھاؤنی اور شہر کو ملانے والے پل سے ٹکرا ٹکرا اپنے غصہ کا اظہار کرتا۔ جیسے
کوئی باپ اپنے بچوں سے نالاں ہو کر اپنا سر پیٹ لیتا ہے! — پُل کو تھوڑا بہت نقصان
پہنچتا اور پھر دریا کی لہریں جیسے اپنے کئے پر خود ہی پشیمان ہو جاتیں۔

دریا ایک باپ ہے جو اپنے بچوں کے لئے زندہ ہے۔ رواں دواں دوڑتا بھاگتا
رہتا ہے — اپنے بچوں کیلئے — اور اُس کے بچے کھیت ہیں۔ جو اُسے دیکھ کر لہلہا
اُٹھتے ہیں! — شام نے جب بھی دریا کو دیکھا ایک مہربان باپ کے روپ میں ہی دیکھا!

مہربان اور شفیق باپ ـــــ !!

شہر کے دوسرے سرے پر تند و تیز برفانی چناب سے نکالی گئی ایک نہر بہتی تھی۔ تیز مزاج باپ کی یہ بیٹی بالکل اپنے باپ پر گئی تھی۔ پہاڑوں سے میدان میں داخل ہونے کے باوجود اُس کی لہریں اُسی طرح چنچل تھیں۔ اُس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اُس کی طبیعت میں اب بھی وہی تیزی۔ وہی جوش اور وہی الھڑپن تھا ـــ اُس کی لہریں اُسی تندی سے بہتی اپنے ساتھ ریت مٹی کو لپیٹائے چلی جاتی تھیں۔ اُس کا پانی بھی اتنا ہی ٹھنڈا تھا جتنا دریائے چناب کا۔

یہ نہر بڑے راجہ صاحب کے دادا نے کھدوائی تھی۔ اور اِس کا نام بھی اُنہیں کے نام پر رکھا گیا تھا۔

بڑے راجہ صاحب کے دادا بڑے پرتاپی راجہ تھے۔ اُن کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔ اسی لئے اُن کے راج میں شیر اور بکریاں دونوں ہی کافی تعداد میں تھے۔ وہ بڑے سخی داتا تھے۔ دل کھول کر دان کرتے تھے۔ دھرماتما راجہ کی پرجا بھی بڑی دھرماتما تھی۔ اپنے گھر میں کھانے کو ہو یا نہ ہو، دِن تہوار کے موقعوں پر دل کھول راج پنڈتوں کو بھینٹ دیتی تھی۔

زمین پتھریلی تھی۔ پانی کی قلت تھی ـــ پیداوار زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ مگر لوگ محنتی تھے۔ محنت اور مشقت کے عادی تھے۔ کہ یہی اُن کی دولت تھی۔ یہی اُن کی میراث تھی۔ آمدنیاں کم تھیں ـــ چار پانچ روپئے پٹواری کی تنخواہ ہوتی تھی۔ مگر پھر بھی لوگ بہت خوش تھے۔ کیوں کہ دھرم کا راج تھا۔ اور دھرم کے راج میں چار پانچ روپئوں میں بھی بڑی برکت تھی۔ بڑے راجہ صاحب کے دادا کو رعایا کا بڑا دھیان تھا۔ بالکل اپنی اولاد کی طرح چاہتے تھے۔

اُنھوں نے شہر کے لوگوں کیلئے پانی کی قلت کے پیش نظر واٹر ورکس بنوا دیا تھا ـــ

لیکن جب تک جیتے رہے کسی سے پانی کی قیمت وصول نہ کی۔ پانی پر ٹیکس نہ لگایا کہ یہ اُنکی شان کے خلاف تھا ــــ راج مریادا کے خلاف تھا ــــ نہر بھی کُھدوائی تو رعایا کی بھلائی کیلئے۔ تاکہ مئی جون کی تپتی ہوئی دوپہروں میں لوگ گرمی سے محفوظ رہیں۔ جب تک جیتے رہے رعایا کے آرام و آسائش کا خیال رکھا۔ نہر سے کئی سوکھے کھیت سیراب ہو گئے، کئی نئے باغ لگ گئے۔ اور سوکھی خشک پیاسی زمین خوشی سے لہلہا اُٹھی ــــ رعایا خوش ہو گئی ــــ کیوں کہ دھرم کا راج تھا۔ سارا شہر مندروں سے بھرا ہوا تھا۔ شہر کی ہر ایک گلی میں، ہر ایک کوچہ میں ایک مندر تھا۔ مختلف دیوتاؤں کے مختلف مندر!! ــــ

ٹھاکر جی کی کرپا اور نہر کی کُھدائی سے پیداوار بڑھ گئی۔ تحصیلداروں، پٹواریوں اور دوسرے سرکاری اہلکاروں کی بھگوان نے سُن لی تھی۔ تنخواہیں تو وہی تھیں۔ مگر آمدنیوں میں اضافہ ہو گیا، برکت بڑھ گئی۔ لیکن کسانوں کی زندگی پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ کہ یہ اُن کی قسمت تھی۔ اور قسمت کو پلٹنا دھرم کے راج کے بس میں بھی نہیں تھا۔ اس میں بڑے راجہ صاحب کے دادا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ تو اُن کے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل تھا۔ وہ خود مندروں میں جا کر بڑے بڑے تلک دھاری پنڈتوں کو اس کی تائید کرتے ہوئے دیکھتے تھے۔ جو آنکھیں بند کر کے جھوم جھوم کر کیرتن کرتے ہوئے گاتے تھے۔

پربھو جی! کرمن کی گت نیاری۔

اور کرموں کی گتی کون بدل سکتا ہے؟ بھگوان کے گھروں سے بھرے ہوئے اس شہر میں کسی قسم کی ناانصافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اُن کا کام ہی یہی تھا کہ محنت مشقت کریں، اناج اُگائیں اور سرکاری اہلکاروں کے حوالے کر دیں۔ کہ یہی اُن کا فرض تھا۔ پچھلے جنم کے گناہوں کی یہی سزا تھی ورنہ وہ کسانوں کے گھروں میں پیدا ہی کیوں ہوتے؟ کسی تحصیلدار، پٹواری، یا کسی دوسرے سرکاری افسر کے ہاں کیوں نہ جنم لیتے کہ پیدا ہوتے ہی اُن کی قسمت میں تحصیلداری پٹواری یا افسری لکھ دی جاتی؟ وہ مٹی کے ان کچے گھروندوں میں کیوں رہتے! ان جھونپڑوں کے

بچائے۔ دو دو، تین تین منزلہ حویلیوں میں کیوں نہ رہتے ؟، کیوں اس طرح خون پسینہ ایک کر کے دھرتی کے پتھر سینے میں سے دو سروں کے لئے سرسبز دھان اور گیہوں پیدا کرتے ؟ ___ رات رات بھر جاگ کر جنگلی جانوروں سے اُن کی رکھوالی کرتے۔ اور خود مکی اور باجرے کی موٹی موٹی روٹیوں پر صبر کرتے ؟ ___

لیکن یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ برسوں سے اسی طرح ہوتی چلی آئی تھی۔ صدیوں سے یہی ہوتا آرہا تھا ___ اور برسوں سے یہ نہر جو بڑے راجہ صاحب کے دادا نے بنوائی تھی۔ اسی آب و تاب سے بہہ رہی تھی۔ چناب کا گدلا ریتیلا پانی اسی زور شور سے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرتا چلا آرہا تھا۔ نہ اُس کی روانی میں کمی آئی تھی اور نہ ہی خنکی میں !

مئی جون کی آگ برساتی ہوئی دوپہروں میں لوگ آج بھی اس نہر کے کنارے گھنے درختوں کے سائے میں دریاں اور چادریں بچھا کر آرام کرتے۔ اُسکے ٹھنڈے یخ پانی میں نہاتے اور اپنے ساتھ لائے ہوئے آموں کے ٹوکرے، دودھ سے بھری ہوئی بوتلیں اور تربوز وغیرہ رسیوں سے باندھ کر اُس میں ڈال دیتے ہیں اور جب وہ برف کی طرح سرد ہو جاتے ہیں تو نکال کر کھاتے ہیں۔

کوئی زمانہ تھا جب سارا دن اس نہر پر ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے بیٹھنے کیلئے جگہ ملنا مشکل ہو جاتی۔ پہاڑوں اور میدانوں کی تہذیب ایک مرکز پر اکٹھی ہو جاتی۔ کسی طرف کسی پیڑ کے تنے سے لگا ہوا کوئی نوجوان الغوزوں کی جوڑی کو ہونٹوں میں دبائے کوئی پہاڑی دھن چھیڑ رہا ہوتا۔ اور کسی طرف بھنگڑا اور بولیاں خون کو گرما رہی ہوتیں ___ لوگ سارا سارا دن نہر میں ڈبکیاں لگاتے اور اونچی آواز میں چناب کے گُن گاتے۔ اُس کے پانی کو دعائیں دیتے رہتے تھے۔

وگ وگ بیں جھناں دیا پانیا !
تیرے کنڈے اُتے عاشقاں نے موجاں مانیاں

اے چناب کے پانی بہتا رہ۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے — تیری خنکی میں کبھی کمی نہ آئے۔ تیرا بہاؤ کبھی سُست نہ ہو۔ کہ تیرے کناروں پر عاشقوں نے زندگی کی بہاریں ڈھونڈی ہیں ... تیری لہروں نے ان گنت رومانوں کو جنم دیا ہے۔

تیرے کنارے عشق و محبت کی کئی داستانیں دوہرائی گئی ہیں — تیری رفتار میں شباب کا جوش اور سرمستی ہے۔ تیرے پانی کی ٹھنڈک جلتے سلگتے ہوئے دِلوں کی آگ بُجھاتی ہے — اُن کی تپش کو دور کرتی ہے — اُن کے لیئے مرہم کا کام دیتی ہے خدا کرے کہ تو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسی طرح بہتا رہے۔ کہ تیرے ہی کنارے پر سوہنی نے پیار کی کبھی نہ بُجھنے والی شمع جلائی — تیری آغوش اُس کے لیئے ماں کی گود بنی۔ اور وہ مٹی کے گھڑے کو سینے سے لگائے تیری لہروں پر سوار ہو کر اپنے مہینوال سے ملنے چل دیتی۔ تیری لہریں اُسے اپنی گود میں اُٹھا کر مہینوال کے پاس پہنچا دیتیں!

وگ، وگ دے چنہاں دیا پانیا

....

تیرا پانی ...... تیری لہریں ...... تیرے کنارے اس دل سوز منظر کے شاہد ہیں، جب سوہنی اور مہینوال ایک دوسرے کیلئے تیری گہرائیوں میں اُتر گئے تھے — تیری لہریں آج بھی اس ہولناک منظر کو یاد کر کے چٹانوں سے سر پھوڑتی پھرتی ہیں!

اے عظیم پانی! — اے عظیم دریا! — میرا سلام قبول کر!

شام راجہ صاحب کی اس نہر کے کنارے کھڑا اُس کی اُچھلتی کودتی موجوں میں گم تھا — اُس کے بچپن کی کئی یادیں چناب سے نکلنے والی! اس تیز رو نہر کے کناروں سے وابستہ تھیں، اُس کی لہروں میں اُلجھی ہوئی تھیں — اُس کے بچپن اور جوانی کے کئی حسین دن اسی نہر کے ریتیلے کناروں پر اپنی سوہنی کے ساتھ گذرے تھے! ان پر ایک قطار میں اُگے ہوئے گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بچپن کے کئی خوشگوار معصوم کھیل

کھیلے تھے۔ بیلا کے ساتھ نہر کے کنارے پھیلے ہوئے آم اور لوکاٹ کے باغوں میں ڈاکے مارے تھے۔ مالیوں کی نظروں سے بچ بچ کر چوریاں کی تھیں۔ اور گھنٹوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دئے اِدھر اُدھر گھومے تھے۔

آموں کا وہی موسم تھا۔ وہی لوکاٹ کے باغ تھے ـــــ آم کے درختوں پر آج بھی کوئلیں بیٹھی تھیں ـــــ پتوں میں چھپی ہوئی کوکو کی سُریلی تان اُڑا رہی تھیں۔ ـــــ اُسے اپنا لڑکپن یاد آ گیا۔ - - - - - - - - - - - - اُس نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ سا بنا کر مُنہ پر رکھا اور کوئل کی آواز کی نقل کرنے لگا ـــــ کوئل اُسے اپنی کسی ہم جنس کی پکار سمجھ کر پھر کوکنے لگی۔

شام کا دل بھر آیا ـــــ

کوئلیں آج بھی اُسی طرح کوکتی تھیں ـــــ

باغوں میں آج بھی آم لگے ہوئے تھے ـــــ!

وہی نہر تھی ـــ!

وہی وہ خود بھی تھا!! ـــ

لیکن بیلا ـــ ؟؟ ....

سب کچھ وہی تھا ـــ ویسا ہی! ـــ مگر کتنا بدل چکا تھا۔ وہ خود بھی کتنا بدل گیا تھا!؟ یہاں سے جانے کے بعد اُس میں کتنا ٹھہراؤ آ گیا تھا! ـــ جیسے اُلھڑ پہاڑی نالے میں سپاٹ میدانوں میں داخل ہوتے وقت آ جاتا ہے! شام میں بھی اب وہ پہاڑی نالے کی سی شوخی نہیں رہی تھی ـــ اب اُس میں وہ اضطراب، وہ چنچلتا نہیں تھی ـــ ......

اب وہ ایک اتھاہ اور گہرا سمندر تھا۔ جس میں کبھی موجیں نہیں اُٹھتیں ...... خاموش.. ساکن ......!!

سب کچھ وہی تھا۔

صرف وہی بدل گیا تھا۔

وقت بدل گیا تھا ـــــ

چناب کا پانی اسی طرح بہہ رہا تھا ـــــ

مگر اب اُس کے کناروں پر عاشق موجیں نہیں اُڑا رہے تھے۔

آج کی سوہنی اتنی جذباتی نہیں تھی کہ محض پیار کی خاطر دریا میں کود جاتی ـــــ محض محبت، اندھی محبت کے لئے کچے گھڑے پر چناب کی لہروں پر سوار ہو جاتی۔ اپنی جان کی پرواکئے بغیر!؟ ـــــ

شام اُداس سا کھڑا اُبھرتی مٹتی لہروں کو دیکھ رہا تھا۔

اکیلا ـــــ!

تنہا ـــــ!!

اب بیلا اُس کے ساتھ نہیں تھی۔

وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ لہروں کو گھورتا رہا ـــــ بچپن کے خدوخال اُبھارتا رہا ـــــ! وقت بدل گیا تھا ـــــ

لیکن چناب کی لہروں کو تو کچھ نہیں ہوا تھا ـــــ ان میں وہی زندگی تھی ـــــ وہی تازگی تھی ـــــ وہی بہاؤ تھا ـــــ

چناب کی روانی اور انسان کی زندگی ـــــ

کتنی ایک جیسی! ـــــ کتنی مختلف ـــــ!!

•••

شام آٹھ برس کا شوخ چنچل بچہ تھا۔ اور بیلا چھ برس کی ــــــ لیکن اس چھوٹی سی عمر میں بھی حُسن کو اپنی اہمیت کا احساس ہو چکا تھا۔

دونوں اکٹھے کھاتے۔ اکٹھے پیتے اور اکٹھے ہی کھیلتے تھے۔ شام اپنے اسکول میں سب سے زیادہ شریر لڑکا تھا۔ ہر چھوٹے بڑے سے چھیڑ چھاڑ کر لیتا ــــ ہر ایک سے لڑائی جھگڑا مول لے لیتا ــــ ذرا سی بات طبیعت پر گراں گذرتی تو مرنے مارنے پر اُتر آتا تھا۔

گوپال اُس کا عزیز ترین دوست تھا۔ دم بھر کی جُدائی بھی گوارا نہ ہوتی تھی۔ لیکن کئی بار معمولی معمولی سی بات پر شام اُس سے بھڑ گیا تھا۔ کئی کئی روز تک وہ اپنے ہمجولیوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ سب لوگ شام کی تیز طبیعت سے نالاں تھے۔ اُس کی شرارتوں سے عاجز تھے۔

لیکن وہی شام بیلا کے سامنے بھیگی بلّی بنا ہوتا ــــ حُسن اپنی تمام تر معصومیتوں کے ساتھ مغرور تھا ــــ شوخ تھا۔ لیکن محبت اپنے سارے بچپن، اکھڑپن اور چنچلتا کے

باوجود سراپا نیاز!

اس چھوٹی سی عمر میں ہی شام اپنا سب کچھ بیلا کو ہار چکا تھا۔ ہر وقت اُس کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔۔۔ دونوں ساتھ ہی ساتھ رہتے۔ ساتھ ساتھ اسکول جاتے ۔۔۔ اکٹھے ہی واپس آتے اور کھیلنے لگتے۔ ہمیشہ اکٹھے ہی کھیلتے۔۔۔ لیکن ہمیشہ جاتے وقت بیلا اُس سے جھگڑ کر ہی جاتی۔۔ یہ روز کا معمول بن چکا تھا۔۔۔ .... ۔۔۔ شام ہمیشہ بیلا کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔۔۔ اُس کی زیادتیوں کو نظر انداز کر دیتا۔۔۔ چاہتا کہ بیلا جس طرح ہنستی کھیلتی آتی ہے۔ اُسی طرح ہنستی کھیلتی جائے ۔۔۔ لڑے جھگڑے کہ کھیل میں لڑائی جھگڑا تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن جانے سے پہلے من بھی تو جایا کرے۔

بیلا آتی، ہنستی کھیلتی ۔۔۔ مگر جاتے وقت ہمیشہ لڑ کر ہی جاتی ۔۔۔ اور شام سوچتا رہتا۔۔۔

"کیا بیلا کبھی بھی اُس سے ہنستے کھیلتے رخصت نہیں ہو گی ۔۔؟ کیا وہ کبھی اُسے اپنا نہیں سمجھے گی ۔۔؟"

وہ اُداس ہو جاتا۔۔۔ آہستہ آہستہ بجھے ہوئے دل سے چلتا ہوا بھولو چاچا کے پاس جا پہنچتا ۔۔۔ اُس کی طرف اپنی چھوٹی چھوٹی بھری ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگتا جیسے اُس سے پوچھ رہا ہو۔۔۔ بیلا کیوں روٹھ جاتی ہے؟ وہ کیوں ناراض ہو جاتی ہے۔۔۔؟؟

اور بھولو چاچا اپنی بوڑھی آنکھوں سے اُس کے مُرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہی مسکرانے لگتا۔ اُس کے ڈاڑھی اور مونچھوں سے بھرے ہوئے چہرے پر بڑی خوبصورت سی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ۔۔۔ وہ اُسے اپنے سینے سے لگا کر اُس کے گالوں کے ساتھ اپنی کھچڑی کھُردری ڈاڑھی رگڑنے لگتا۔ اور بڑے پیار سے پوچھتا۔۔۔۔

"پھر جنگ ہو گئی بیلا سے ؟"

شام اس ایک فقرہ سے ہی اپنا تمام غم بھول جاتا۔ خود بخود مسکرانے لگتا۔ بھولو چاچا ہی تو واحد شخص تھا جو اس کا سچا ساتھی تھا۔ اس کے ہر راز کو جانتا تھا۔ اُس کی ہر بات کو بھانپ لیتا تھا۔ شام اپنے تمام دُکھڑے اُسے سنا دیتا تھا۔ گھر میں اور تھا بھی کون جسے اُس کی باتیں سُننے کی فرصت ہوتی ؟؟

آج تک کسی لڑکے یا لڑکی کو اُس کی طرف دیکھنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بیلا اعلانیہ اُس سے نفرت کا اظہار کرتی۔ اُسے بُرا بھلا کہتی ۔۔۔ ایک بار تو اُس نے غصہ میں آکر شام کے مُنہ پر تھپڑ بھی مار دیا تھا۔ لیکن شام جیسے بے جان مجسّمہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کی ۔۔۔ لب تک نہیں ہلائے ۔۔۔ خاموش کھڑا اُس کی طرف دیکھتا رہا تھا ۔۔۔ صرف چوٹ پڑنے پر اُس کے ہاتھ ایک بار لاشعوری طور پر جواب دینے کیلئے ہلے تھے کہ وہ اُس کا عادی نہیں تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بھول کر رہ گئے تھے۔ وہ بس اُس کی طرف دیکھے جا رہا تھا! ۔۔۔

بیلا نے خود ہی کئی بار اُسے ٹوٹلا تھا ۔۔۔

"بڑے بہادر بنتے ہو ۔۔۔ لیکن میرے سامنے تم بھیگی بلّی بن جاتے ہو ۔۔۔!"

وہ خاموش رہا ۔۔۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔

بیلا نے پھر چھیڑا ۔۔۔ "سب کو روئی کی طرح دُھن کر رکھ دیتے ہو۔ لیکن میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیتے !"

"معلوم نہیں بیلا! کئی بار جی چاہتا ہے ..... لیکن پھر نہ جانے کیوں ہاتھ ہی نہیں اُٹھتا جیسے ..... میں خود حیران ہوتا ہوں۔"

"لیکن کیوں ۔۔۔ ؟"

"یہ کیوں ۔۔۔ بیلا! "یہ کیوں" ہی تو اب تک میری سمجھ میں نہیں آیا ۔۔۔"

اُس نے بڑی حسرت بھری نظر سے ببلا کو دیکھا۔

ببلا ٹکر ٹکر اُس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ جیسے اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اُس کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیکن یہ بات اُسکے چھوٹے سے معصوم سے دماغ کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی اور شام حیران حیران اُداس اُداس سی آنکھوں سے اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو ۔۔۔

"ببلا! ۔۔۔ یہ دل کی باتیں ہیں دماغ کی سوچیں اِن تک نہیں پہنچ سکتیں۔ یہ اُس دُنیا سے بہت پرے کے راز ہیں۔ جن میں تم رہتی ہو ۔۔۔ یہ باتیں اونچی اونچی حویلیوں میں نہیں سمجھی جاتیں ۔۔۔ ان مقدّس باتوں کو سمجھنے کے لئے مقدّس ماحول کی ضرورت ہے! جو فلک بوس محلوں میں نہیں ملتا۔ اُجلے ریشمی کپڑوں میں نہیں ملتا۔ اس کیلئے ایک دل کی ضرورت ہے .... ایک محبت کی ضرورت ہے۔ ایثار کی ضرورت ہے اور یہ چیزیں ایسی نہیں ہیں جو تم اپنے باپ سے کہہ کر بازار سے منگوا لو۔ جیسے تم اکثر کھلونے کپڑے اور گہنے منگوا لیتی ہو! ۔۔۔ مجھے دیکھو! ۔۔۔ میں تم سے زیادہ طاقتور ہوں۔ چاہوں تو آنکھ جھپکنے کی دیر میں تمہیں اُٹھا کر پٹخ سکتا ہوں۔ لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ تم ببلا ہو۔! دادی اماں کی کہانیوں کی پری ہو ۔۔۔! کسی دور دراز ستارے کی شہزادی۔ جو اسکول میں ملنے سے بہت پہلے میرے خوابوں کو سجایا کرتی تھی ۔۔۔!"

لیکن وہ خاموش کھڑا تھا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکا تھا۔ صرف اُسے دیکھتا رہا ۔۔۔ اُس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں ڈوبتا رہا ۔۔۔

ببلا اُس کی کھوئی کھوئی نظروں سے اُکتا گئی ۔۔۔

"اِس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟"

وہ خاموش رہا۔

"گھور کیوں رہے ہو؟ اُٹھو ۔۔۔ ایک بازی کیرم کی کھیلتے ہیں۔"

شام کسی سحر زدہ ہستی کی طرح اپنی جگہ سے ہلا ۔۔۔ کیرم بورڈ اُٹھا کر میز پر

رکھا۔ اور گوٹیں جمانے لگا۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بیلا بڑھ بڑھ کر اپنی گوٹوں کو کونوں میں ڈال رہی تھی۔ مگر شام نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ اپنی باری پر وہ کھوئے کھوئے انداز میں سٹرائیکر سنبھالتا۔ اور بے دلی سے چوٹ لگا دیتا ۔۔۔ اب تک اس کی ایک گوٹ بھی کونے میں نہیں گری تھی۔ بیلا کو رہ رہ کر اُس پر غصہ آنے لگا تھا۔ شام کی بسورتی ہوئی صورت اور کھیل سے لاپروائی پر وہ جھنجھلا رہی تھی۔

بیلا سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُس نے جھنجھلا کر بورڈ اُٹھایا اور زور سے پٹخ دیا۔ ساری گوٹیں کھڑکھڑاتی ہوئی ادھر اُدھر بکھر گئیں۔ بیلا غصہ میں بھری ہوئی اُٹھی۔ اور پیر پٹختی ہوئی کمرے سے نکل گئ۔

شام بھرے ہوئے دل سے اُٹھا اور خاموشی سے بھولو چاچا کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا بھولو چاچا نے اپنی گڑگڑی ایک طرف رکھ دی اور اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"بیلا سے پھر جنگ ہو گئ؟

اُس نے اُس کے کندھے کو تھپتھپایا شام جھٹ اُس کے سینے سے لگ گیا۔ اور بلک بلک کر رونے لگا۔

"جنگ کیا ہوتی ہے چاچا؟"

بھولو نے بچوں کی طرح منہ بنا کر کہا۔

" ایک طرف کوئی روئے۔ دوسری طرف کوئی ہنستا ہوا سو جائے۔ اُسے جنگ کہتے ہیں!"

شام نے بھولو چاچا کی جھرّیوں میں اپنی روتی ہوئی آنکھوں کے آنسو چھپا لئے۔

●●●

گرمیوں کے دن تھے۔ اُن کا اسکول پکنک منانے کے لئے نہر پر آیا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے کھیل کود میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ بچے رسّہ کشی میں مشغول تھے ـــ کچھ نہانے میں ـــ کچھ بچے دوڑ لگا رہے تھے۔ بڑی جماعت کی لڑکیاں کھانا پکانے میں لگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک اپنی دھن میں مگن تھا۔

شام۔ بیلا۔ اور گوپال اِن سب سے نظریں چُرا کر دور نکل گئے تھے ـــ اور درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں نہر کے کنارے بچھی ہوئی ریت پر کھیل رہے تھے۔ دیر تک تینوں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہے ـــ دوڑتے رہے ـــ ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے رہے۔

جب کوئی ایک دوسرے کو چھو لیتا تو ہانپتی پھولی ہوئی سانسوں میں سے ایک چیخ سی پھسل جاتی ـــ ایک قہقہہ اُبھر کر فضاؤں میں بکھر جاتا۔ پاؤں کے نیچے بچھی ہوئی ریت اُن کے تلوؤں میں گدگدی سی کرنے لگتی ـــ جب وہ دوڑ دوڑ کر تھک جاتے تو اُسی ریت پر بیٹھ کر باغوں سے چُرائے ہوئے کھٹے میٹھے آم نہر کے پانی میں ٹھنڈے کر کے کھاتے۔ ایک

دوسرے پر پانی کے چھینٹے اُڑاتے ــــ برف کی طرح ٹھنڈے پانی کا لمس اُن کے جسموں میں جھرجھری سی پیدا کر دیتا۔ اُن کے بھرے بھرے چھوٹے چھوٹے رُخسار اُس کی ٹھنڈک سے تمتما اُٹھتے اور وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگتے ــــ قہقہے لگاتے ــ اور ہنستے ہنساتے قہقہے لگاتے بیلا اُس کا مُنہ چڑا دیتی ــ وہ اُٹھ کر اُسے پکڑنے کیلئے دوڑتا ــ بیلا بھاگ جاتی ــ اور گوپال نہر کے ٹھنڈے یخ پانی میں پاؤں لٹکائے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیتا ــ دونوں دیر تک ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہتے اور پھر تھک کر ریت پر آ بیٹھتے ــــ

جب دوڑتے دوڑتے ٹانگیں دُکھنے لگیں، پانی میں کھیلنے سے بھی طبیعت اُکتا گئی تو شام کنارے کی گیلی ریت کو اپنے پاؤں پر ڈال ڈال کر اُسے دبانے لگا۔ کچھ دیر تک اسی طرح پاؤں پر ریت جمع کر کے دباتا رہا۔ پھر آہستہ سے اپنا پاؤں اُس ڈھیر میں سے باہر کھینچ لیا۔ ایک چھوٹا سا غار سا بن گیا تھا ــ جیسے کسی نے کوئی ایک کونے سے ٹوٹا ہوا پیالہ اُلٹ کر رکھ دیا ہو۔ تھوڑی سی دیر میں شام نے اِسی قسم کے تین چار گھروندے بنا ڈالے۔ پھر ریت کو کرید کرید کر سڑکیں بنائیں۔ جو ان سب کو ایک دوسرے سے ملاتی تھیں ــ اِن گھروندوں اور سڑکوں کے گرد اُس نے ریت کی ایک دیوار کھڑی کی اور پھر ایک ماہرِ تعمیر کی طرح کھڑا ہو کر اُس کا جائزہ لینے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ جیسے کسی عظیم فنکار کی آنکھوں میں اپنی شاہکار تخلیق دیکھتے وقت آ جاتی ہے!

گوپال اور بیلا بھی پاس کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اُس کی کوششوں پر مسکرا رہے تھے۔ بیلا کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"شام نے پوچھا ــ

"کیسا لگا ــ؟"

"کیسا؟" ــ مسکراتے ہوئے شریر لب ہلے۔

"میرا گھر! دیکھو کتنا شاندار بنایا ہے!"

"یہ گھر ہے؟" لہجے میں تمسخر تھا۔

"اور کیا؟ چار بنگلے ہیں! ہر ایک بنگلے تک اپنی سڑک جاتی ہے۔ مین دروازہ تک کار جا سکتی ہے! اور پھر چاروں بنگلے ایک چہار دیواری سے گھرے ہوئے ہیں۔ سارے شہر سے الگ تھلگ!" شام نے اُسے کسی ماہر فنکار کی طرح سمجھایا —

"ہوں" —

"ہوں کیا؟"

"ہوں!"

"کچھ کہو بھی تو —"

"یہ چار کوٹھیاں کیا کرو گے؟" بیلا کی جگہ گوپال نے سوال کیا۔

"ایک میں پاپا اور ماتا جی رہیں گے......"

"اور دوسری؟"

"دوسری کوٹھی دادی اماں کو دے دیں گے!"

"اور باقی دو کوٹھیاں کیا کرو گے؟" بیلا کی آواز تھی —

"شام خوش ہو گیا — آخر بیلا اُس کی بنائی ہوئی کوٹھیوں میں دلچسپی لینے ہی لگی تھی۔

"اِن میں سے جو چھوٹی ہے نا وہ بھولو چاچا اور دوسرے ملازموں کو دیدیں گے اور دوسری — دوسری میں ہم دونوں رہیں گے۔!"

بھولے بھالے بچپن کی معصوم سی محبت کا پہلا اظہار تھا — سیدھا سادہ۔ بے لاگ اظہار!!

بیلا کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ گوپال کی طرف دیکھ کر

مسکرائی۔

"نہ بابا — ہم نہیں رہتے ان ریت کے گھروں میں۔ ! — ہمیں تو معاف ہی کرو — !" بیلا نے کانوں کو پکڑتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں ! بیلا ہماری پکی حویلی میں رہے گی ! — ہے نا بیلا ؟" — یہ گوپال کی آواز تھی۔

"لیکن وہ تو ...." شام نے کچھ کہنا چاہا۔

"یہ ریت کے گھر تمہیں کو مبارک ہوں۔ ہم مُفت کے نہیں ہیں !"

بیلا نے یہ کہتے ہوئے اُس کے بنائے ہوئے گھروندوں پر چھلانگ لگائی۔

بھولے بھالے چنچل حُسن کا پہلا انکار تھا !!

ریت کے گھر تھے — ریت کی دیواریں — پل بھر میں ٹوٹ گئیں — ریت میں مل گئیں — چاروں بنگلے — سڑکیں، ان کو گھیرے میں لینے والی دیوار اب وہاں کچھ بھی نہ تھا — محض ریت کا ایک بے ترتیب ڈھیر تھا — جس پر بیلا کے قدموں کی گہری چھاپ پڑ گئی تھی۔

سامنے گوپال کھڑا ہنس رہا تھا۔ بیلا ہنس رہی تھی۔ ساری کائنات ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی۔ اُس کی ناکام کوشش، ...... اُس کے ریت کے گھروندوں ... اُس کی تمناؤں کا مضحکہ اُڑا رہی تھی۔

شام کو بڑا دھچکا لگا۔ جیسے عین دل کے مقام پر کسی نے کوئی بھاری چٹان اُٹھا کر دے ماری ہو۔ جیسے بیلا نے اُس کے بنائے ہوئے گھروندوں کو نہیں خود اُس کے دل کو مسمار کر دیا ہو۔ اُس کے پاؤں نے ریت کے گھروندوں کو نہیں اُس کے دل کو توڑ دیا ہو اور وہ ریزہ ریزہ ہو کر ریت کے ذرّوں کی شکل میں اُس کے سامنے پڑا ہو۔ بیلا کے گورے گورے سبک سے پاؤں جیسے اُس کے دل پر جم کر رہ گئے تھے !

ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ ایک دم مرجھا گیا۔ بڑے سے بڑا زخم وہ ہنس کر کھاتا تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے کہاں سے اُس کی آنکھوں میں سے لاوا پھوٹ نکلا؟ آنسوؤں کی شکل میں اُس کے تمتمائے ہوئے رخساروں پر پھیل پھیل کر نم آلود ریت میں جذب ہونے لگا۔ ہر چیز دھندلا گئی۔ اگر کسی دوسرے نے اُس کے گھروندے توڑے ہوتے ...... ؟ اگر کسی اور نے اُس کا تمسخر اُڑایا ہوتا؟ ...... اگر گوپال نے کبھی اُس کی اس طرح توہین کرنے کی جسارت کی ہوتی؟ ...... تو وہ اُس کی بوٹیاں نوچ چکا ہوتا۔ تو شاید وہ —— ؟؟ ......

لیکن یہ بیلا تھی!

وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

صرف روتا رہا۔

اپنے ٹوٹے ہوئے گھروندوں کو دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتا رہا —— جواب پھر ریت میں رل گئے تھے۔

گوپال اب بھی مسکرا رہا تھا —— شام نے اُس کی طرف دیکھا اور اپنی آنکھیں پونچھ لیں ——

"بیلا! —" اُس کی آواز میں ایک نیا عزم تھا۔

"بیلا! میں پکا مکان بھی بنوا سکتا ہوں۔ تمھاری حویلی سے بھی بڑا —— وہ گوپال کی کوٹھی سے بھی اونچا ہوگا —— ان دونوں سے خوبصورت ہوگا —— میں بھی کار خریدوں گا۔ اور پھر تمھیں اُس میں بٹھا کر گھمانے لے جاؤں گا۔"

"ہمارے پاس اپنی کار ہے —— وہی اچھی ہے۔"

"میری کار اُس سے بڑی ہوگی اور شاندار ہوگی!"

"معاف کرو بھئی —— ہمیں تو وہی اپنی کار ہی ٹھیک ہے۔" بیلا جیسے آج

تلی ہوئی تھی کہ اُسے ہر بات میں مات دے گی ــــ ذلیل کرے گی ــــ! وہ جیسے شام سے جھگڑا کرنے کیلئے تیار ہو کر آئی تھی۔

شام ہار گیا۔ خاموش ہو گیا۔

شام کی پہلی ہار تھی!!

گوپال کی پہلی جیت تھی!!

گوپال کی مسکراہٹ اب ایک بلند قہقہے میں بدل گئی تھی۔

دن ڈھل چکا تھا۔ پکنک ختم ہو گئی تھی۔ اسکول سے لوگ واپس جانے کی تیاریاں کر رہے تھے!

●●●

بیلا پتھروں کے اس شہر سے سو میل دور راجپورہ کی رہنے والی
تھی جو کھلے سپاٹ میدانی علاقہ میں تھا۔

تھا تو یہ بھی چناب ہی کے کنارے۔ مگر یہاں آکر اس سرکش برفانی دریا کی رفتار بھی ماند پڑ گئی تھی۔ اُس کی الہڑ رومانی لہریں یہاں پہنچ کر کچھ سہم سی گئی تھیں۔ جیسے کوئی پہاڑی دوشیزہ قدرت کی آزاد کھلی فضاؤں سے نکل کر شہر میں داخل ہو جائے۔ غیر مانوس ہماہمی اور بھیڑ بھڑکے میں گھر کر سہم جائے!

راجپورہ چھوٹا سا قصبہ تھا، جو اب اچھا پر رونق شہر بن گیا تھا۔ دن بدن بڑھتا پھیلتا جا رہا تھا۔ یہاں کے رہنے والے یا تو کارخانہ دار تھے اور یا ساہوکار —— اس بڑھتے پھیلتے ہوئے صنعتی شہر کے تمام لوگوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی "دار" یا کار ضرور چپکا ہوا تھا۔ ان کار..ں اور دارون کے علاوہ ایک اور طبقہ بھی تھا۔ جس کا وجود صرف اس لئے برداشت کیا جاتا کہ ان کی کاری اور داری قائم رکھنے کیلئے نہایت ضروری تھا۔ یہ طبقہ دن رات خون پسینہ ایک کرتا —— کارخانوں میں چاقو، چھریاں

کانٹے، خنجر بید اور دوسری لکڑی کی چھڑیاں وغیرہ بناتا اور شام کے وقت اپنے جھونپڑوں میں جاکر سوجاتا۔ یہ لوگ سب سے کم کھاتے۔ سب سے کم شکایت کرتے، اور سب سے زیادہ محنت اور مشقت کرتے تھے۔ دن بھر کی جان توڑ محنت کے بعد جو کچھ ملتا تھا اُس میں سے آدھا ساہوکاروں کی نذر ہوجاتا۔ باقی مزدوری سے آدھا پیٹ بھی مشکل ہی سے بھرتا تھا۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ اُف نہیں کرتے تھے۔ دن رات بیل کی طرح جُتے رہنے کے بعد بھی اتنا نہیں ملتا تھا کہ اپنی روزمرّہ کی ضروریات پوری کرسکتے اس لئے دن، تہوار، بیاہ شادی کے موقعوں پر ساہوکاروں سے بھاری سود پر قرض لیتے تاکہ کارخانہ داروں کے ساتھ ساتھ ساہوکاروں کا کام بھی چلتا رہے۔

بیلا کے دادا بھی اِس چھوٹے سے صنعتی شہر میں ساہوکارہ ہی کرتے تھے کیونکہ اس سے زیادہ آرام دہ اور منفعت بخش کاروبار کوئی تھا بھی نہیں ـــــ! اس میں نہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت تھی، نہ محنت کی۔ اُن کے اجداد اسی پیشہ کے طفیل کافی دولت چھوڑ گئے تھے جس میں اسامیوں کی بدولت دن رات اضافہ ہی ہوا تھا۔ آرام سے گھر بیٹھے بیٹھے دولت کے انبار لگتے جاتے تھے لیکن بیلا کے باپ پنڈت پیارے لال کو ایک ہی جگہ پر بیٹھ کر اس طرح روپیہ بٹورنا پسند نہیں تھا۔ پنڈت پیارے لال کے والد تو منیمی تک ہی پڑھے تھے، اپنے ہی کھاتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں لکھ سکتے تھے۔ لیکن پنڈت پیارے لال نے خاندانی روایات کے خلاف اور اپنے باپ کی شدید مخالفت کے باوجود دسویں تک تعلیم حاصل کر ہی لی تھی۔

شہر کی آب وہوا اور انگریزی تعلیم نے اُن کے سامنے اور بھی کئی دروازے کھول دئے تھے۔ باپ کی طرح ایک محدود سے دائرہ میں لوٹ کھسوٹ کرنے کے خلاف تھے اس لئے جب تک باپ کا سایہ قائم رہا، خاموش رہے۔ لیکن باپ کے مرتے ہی اُنھیں اپنی خواہشات پوری کرنے کا موقع مِل گیا۔ لمبے ہاتھ تھے ـــــ اثر ورسوخ والے آدمی

تھے۔ بیلا کی دو بڑی بہنوں کی شادی باپ کی زندگی ہی میں کر دی تھی۔ دونوں لڑکیاں
شام ہی کے شہر کے بڑے اونچے گھرانوں میں بیاہی گئی تھیں۔ دونوں کے شوہر اعلےٰ سرکاری
عہدوں پر لگے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے سرکاری افسر تھے۔ اس لئے انہیں ماحول، نئی جگہ میں قدم
جمانے میں کوئی دِقّت نہ ہوئی۔

پنڈت پیارے لال سیٹھ اب پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ کوئی زیادہ
فرق نہیں پڑا۔ چند پہاڑی دہقانوں کو جو اُن کے راجپورہ میں مزدوری کی تلاش میں چلے جاتے
تھے چھوڑ کر اُنھوں نے خود پہاڑوں ہی کو اپنا لیا تھا۔ جنگلات کے ٹھیکیدار تھے ——
کسانوں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کی دولت بھی ان کی تجوریوں کی طرف بھاگنے لگی تھی۔

اپنے میل جول اور اثر و رسوخ سے چند ہی دنوں میں پنڈت پیارے لال جنگلات کے
سب سے بڑے ٹھیکیدار بن چکے تھے۔ گھنے گھنے جنگلوں کے بھاری بھاری ٹھیکے لیتے۔
سرکاری افسروں کو بھاری بھاری دعوتیں دیتے۔ تحفوں اور ڈالیوں سے نوازتے اور
اُن پر دھڑا دھڑ روپیہ خرچ کرتے کہ روپیہ ہی روپے کو کھینچتا ہے۔ اور جب تک کانٹے
کے ساتھ چارہ نہ لگایا جائے کوئی مچھلی اُسے نہیں نگلتی پنڈت پیارے لال یہ بات اچھی طرح
جانتے تھے۔ اس لئے ریاست کے سربرآوردہ شخص تھے۔ معزز ین میں شمار ہوتے تھے
بڑے بڑے سرکاری افسروں اور وزیروں تک رسائی تھی۔ بلکہ یارانہ تھا —— کیوں کہ
سب کے ہاں اُن کا دیا ہوا کوئی نہ کوئی تحفہ تھا —— دھارمک کاموں کیلئے دل کھول کر
چندہ دیتے۔ چوری چھپے انقلاب پسندوں اور کانگریس کے نمائندوں کی بھی مالی امداد
کرتے رہتے کہ نہ جانے کل کیا ہو جائے —— ؟ کس کے سامنے جھکنا پڑے ؟ ——
کس کی حکومت ہو جائے ؟ —— اُس وقت یہی چوری چھپے دیا ہوا روپیہ ہی آڑے
آئے گا!

پیارے لال بڑے دور اندیش آدمی تھے۔ اس لئے ہر ایک سے بڑے تپاک سے

پیش آتے تھے۔ اُن کے ڈرائنگ روم میں ایک سیاسی رہنما، عوام کے نیتا۔ اور ایک سرکاری افسر میں کسی قسم کی تمیز نہیں کی جاتی تھی۔ وہ دونوں کے خادم تھے۔ لیکن اپنے سجے ہوئے ڈرائنگ روم کی دہلیز کی حد تک! جب تک کوئی بڑا آدمی، سرکاری افسر یا سیاسی لیڈر اُس دہلیز کے اندر رہتا، پیارے لال سراپا نیاز نظر آتے۔ لیکن اُس کے ڈرائنگ روم سے نکلتے ہی کچھ ایسی سانس لیتے جیسے کوئی بھاری بلا ٹلی ہو۔ جب تک کوئی اُن کے کمرے میں رہتا۔ وہ زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں سے چپکائے رکھتے کہ اپنی پوزیشن قائم رکھنے کیلئے یہ ضروری تھا۔ اس تصنع، اس بناوٹ کے بغیر اُن کا وجود ہی ناممکن تھا۔ ٹھیکیداری ناممکن تھی۔

پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار کی بیٹی بیلا اسی مصنوعی اور سرمایہ دارانہ ماحول میں پلی تھی، اُسے اپنی دولت پر ناز تھا۔ حُسن پہ غرور تھا۔ شام جیسا لڑکا اُس کے ماحول میں کھپ ہی نہیں سکتا تھا۔ بیلا چمک دمک کی عادی تھی، زندگی میں صرف شوخ و شنگ رنگوں کو دیکھنے کی عادی تھی ۔۔۔۔ بھڑکیلے قیمتی لباس اور خوبصورت موٹروں کی دلدادہ تھی۔ ماں باپ کی لاڈلی تھی، اُس کے ایک اشارے پر دُنیا کی ہر نعمت حاضر کر دی جاتی تھی۔ اس لئے طبیعت میں ضدّی پن کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

بیلا کیلئے زندگی محض حُسن، رعنائی اور دولت کا نام تھا جس ماحول میں شام رہ رہا تھا، بیلا کو اس سے شدید نفرت تھی۔ اُس کو شام کے چھوٹے سے دو منزلہ مکان سے نفرت تھی۔ اُس کے باپ سے نفرت تھی کہ وہ محض ایک اسکول کا مالک تھا۔ ہیڈ ماسٹر تھا ۔۔۔ کوئی بڑا ٹھیکیدار یا سرکاری افسر نہیں تھا۔

اس کے ساتھ گوپال جیسا لڑکا ہی چل سکتا تھا۔ جو اُسی کے طبقہ کا تھا۔ دولتمند باپ کا بیٹا تھا جس کے پاس ایک شاندار موٹر تھی۔ کئی بنگلے تھے ۔۔۔ بے شمار دولت تھی ۔۔۔ جو اس تمام جائیداد کا تنہا وارث تھا۔ بیلا کے خوابوں میں ایسے ہی ایک لڑکے

کی تصویر تھی۔ جو اُسے حسین ترین زندگی سے روشناس کرا سکے۔ اپنے بڑے سے آرام دہ موٹر میں بٹھا کر ان دیکھی دُنیاؤں کی سیر کرا سکے۔ دُنیا کی ہر خوبصورت چیز لا کر اُس کے قدموں میں رکھ دے۔ اس کسوٹی پر شام کسی حالت میں بھی پورا نہیں اُترتا تھا۔

بیلا اُسی وقت سے گوپال کو اپنا چکی تھی۔ جب وہ اس کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر اُس کے شاندار بنگلے میں گئی تھی۔

لڑکپن کی عمر الھڑ اور آزاد تھی ــــ اُچھلتی کودتی کب کی بھاگ چکی تھی۔ اب بیلا وہ چھوٹی سی شوخ چنچل گڑیا نہیں تھی۔ وہ جوان تھی ــــ شام جوان تھا! دونوں کے مکان اُسی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے پستی، اور بلندی کا فرق سمجھا رہے تھے دونوں اب بھی ساتھ ہی ساتھ پڑھتے تھے۔ رات گئے تک باتیں کرتے۔ مگر دولت کی دیوار جو شروع ہی سے دونوں کے درمیان حائل تھی۔ اُسی طرح قائم تھی۔ بلکہ کچھ اور بلند ہو گئی تھی۔ شام اُس کے قریب ہوتے ہوئے بھی خود کو اُس سے بہت دور محسوس کرتا تھا۔

بیلا کچھ اور نکھر آئی تھی۔ کچھ اور سنور گئی تھی، اُس کی چال میں کچھ اور لوچ، کچھ اور لچک پیدا ہو گئی تھی۔ شام اُس میں آنے والی ایک ایک تبدیلی کو دیکھ رہا تھا۔ کچی کلی اب کھِل کر پھول بننے کی تیاری کر رہی تھی۔ بیلا کا دُبلا پتلا جسم اب گداز اور سڈول ہوتا جا رہا تھا جسم کی اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اُس کے دل میں موجود شام سے نفرت بھی بڑھ رہی تھی۔ اُس کا برتاؤ دن بدن بدل رہا تھا۔ اپنے ماحول کے نقوش اُسکی ہر ادا سے ظاہر ہونے لگے تھے! ــــ شام سے ملتی تو محض اپنی امارت جتانے کے لئے ــــ اُسے اپنی کسمپرسی اور مفلسی کا احساس دلانے کیلئے ــــ لیکن شام خاموش تھا۔ جیسے کچھ نہ دیکھ رہا ہو، کچھ نہ سُن رہا ہو۔ وہ بس ایک ٹک اُس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اور پھر جیسے اپنے ہی خیالوں میں کھو جاتا۔

بیلا ایک دلکش مرمریں مجسمہ تھی ۔۔۔ حُسن و رعنائی کا مکمل پیکر ۔ متناسب سڈول اعضار بڑی بڑی بھوری آنکھیں ۔۔۔ کمر تک بل کھاتے ہوئے گھرے سیاہ بال !۔۔۔ اُس کا ایک ایک انگ تھرکتا تھا ۔ ! رقص کرتا تھا ! ۔ تیرتا ہوا نظر آتا تھا ۔ اور یہ تیرتا ہوا مرمریں وجود پوری شدت سے گوپال کی پرستش کرنے لگا تھا !! ۔۔۔ ،

•••

جوں جوں میلا شریر اور چنچل ہوتی جا رہی تھی۔ شام کی خاموشی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ اور گم سُم رہنے لگا تھا۔ اب وہ پہلے کا سا شریر اور چُلبلا لڑکا نہ تھا جس سے ہر شخص پناہ مانگتا تھا۔ جس کا دماغ نت نئی شرارتیں سوچا کرتا تھا۔ اب اُس میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ جیسے کوئی سرکش پہاڑی نالہ اوبڑ کھابڑ راستوں سے گذرتا، چٹانوں اور پتھروں سے ٹکراتا، ایک دم سپاٹ بے نشیب و فراز میدانوں میں داخل ہو گیا ہو ــ نئے ماحول، نئی دھرتی پر آ کر ــــ حیران حیران سا اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا ہو ــــ رُک رُک کر اپنے گرد و پیش کا جائزہ لے رہا ہو!

شام اب ایک سمندر کی طرح گمبھیر ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی شوخ و شریر چمک نہ جانے کہاں غائب ہو چکی تھی؟ اور اُس کی جگہ ویرانی نے لے لی تھی۔ وہ ہر وقت کھویا کھویا سا رہتا، اب نہ وہ شرارتیں تھیں اور نہ وہ آزاد، دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے قہقہے! ایک ابدی خاموشی تھی جو اُسے چاروں طرف سے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی۔

بوڑھا بھولو چاچا اُسے اِس طرح مُرجھایا ہوا دیکھتا ــــ تو ایک لمحہ کے لئے اپنی

گڑگڑی ہاتھ سے رکھ دیتا۔ اپنی مچی مچی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتا اور سر ہلاتے ہوئے کہتا۔

"ہونے جینے والی باتیں کرو۔۔۔!"

پھر وہ اپنی گڑگڑی اُٹھا لیتا۔۔۔ دو تین لمبے لمبے کش لے کر اُس کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھ کر کہتا۔

"تمھاری یہ باتیں ہونے جینے کی نہیں ہیں۔"

بھولو چاچا کی بوڑھی آنکھوں میں نمی آجاتی۔۔۔ اُس نے واقعی اُسے اولاد کی طرح پیار کیا تھا۔ اُسے اس طرح اُداس اُداس دیکھ کر اُس کا بوڑھا، معصوم دل دکھی ہو اُٹھتا۔ لیکن شام کے پاس اُس کا دُکھ دور کرنے کا کوئی علاج نہ تھا۔ جن باتوں کو بھولو چاچا اپنی اکھڑ دیہاتی زبان میں ہونے جینے والی کہتا تھا وہ اُس کے بس سے باہر تھیں۔ وہ خود اُن کا خواہاں تھا۔ مگر۔۔۔۔۔؟؟

بیلا آتی۔ اُس سے ملتی۔ باتیں کرتی۔۔۔ مگر وہ بُت کی طرح خاموش سُنتا رہتا۔ اُس کی طرف دیکھتا رہتا۔ اُس کی گہری بھوری آنکھوں میں اپنی کھوئی کھوئی سی ویران آنکھیں گاڑ دیتا۔ جیسے بیلا کی آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔۔۔! بیلا کھیج سی جاتی، جھنجھلا اُٹھتی۔۔۔ اُس کی ان متلاشی آنکھوں سے اُسے وحشت سی ہونے لگتی تھی۔۔۔ وہ بگڑ کر پوچھتی۔۔۔

"تم ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہے ہو؟"

لیکن وہ کیا جواب دیتا۔۔۔؟ بس خاموش دیکھتا رہتا۔ ہزار چاہتے ہوئے بھی وہ دل کی بات، زبان پر نہ لا سکتا۔۔۔ شاید دل کی بات کہنے کی خواہش ہوتے ہی اُسے اپنے ٹوٹے ہوئے ریت کے گھروندے یاد آجاتے تھے۔۔۔! اپنے جلتے ہوئے بکھرتے ہوئے ارمانوں کی چتا یاد آجاتی تھی۔۔۔ بیلا کے چھوٹے چھوٹے نازک مرمریں

پاؤں کے وہ نشان اُبھر آتے۔ جو آج بھی اُس کے دل پر اُسی طرح تازہ تھے! گوپال کا بلند و بے ہنگم قہقہہ یاد آجاتا۔ اُس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتا۔ دل کی بات پھر دل ہی میں رہ جاتی۔

اُس کے کانوں میں بیلا کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح سنسنانے لگتے —— اپنی چھوٹی سی جھونپڑی کو دیکھو —— میرے پاپا اس وقت ریاست کے سب سے بڑے ٹھیکیدار ہیں۔ تمھارے اسکول جیسے لاکھوں اسکول خرید سکتے ہیں —"

وہ جانتا تھا کہ بیلا کسی حالت میں بھی اُس کی نہیں ہو سکتی۔ وہ ساری زندگی اُس کے قریب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی اُس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ سراب کو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیلا کی کڑوی کسیلی باتیں جیسے اُس پر کچھ اثر ہی نہیں کرتی تھیں —— ایک عجیب سی کوشش تھی —— عجیب سی دوڑ تھی —— وہ بے اختیار بیلا کو حاصل کرنے کیلئے دوڑ رہا تھا —— اُس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ لیکن بیلا اُس کی پہنچ سے بہت پرے تھی۔ بھاگ رہی تھی۔ گوپال کو پانے کیلئے دوڑ رہی تھی —— تینوں ایک ہی سمت میں دوڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔

شام کبھی کبھی اس مسلسل دوڑ میں پل بھر کے لئے ٹھہر جاتا۔ رُک کر سوچنے لگتا۔ —— یہ کیسی دوڑ ہے؟ —— یہ کیسا تعاقب ہے؟؟ —— ہم کیا چاہتے ہیں؟؟ —— یہ کیسی زندگی ہے؟ —— یہ کیسی دُنیا ہے کہ جسے چاہا —— جو کچھ چاہا، نہ مل سکا —— نہیں پا سکا ——!

پھر خیال آتا —— اس میں زندگی کا تو کوئی دوش نہیں —— دُنیا کا تو کوئی قصور نہیں —— وہ بھی تو لوگ ہوتے ہیں جنہیں نہ چاہنے پر بھی ہر چیز اپنے آپ مل جاتی ہے۔ بھوک نہ ہونے پر بھی کھانا اُن کے سامنے لگا دیا جاتا ہے —— جنہیں ہر چیز مہیا ہو جاتی ہے، اپنے آپ بغیر کسی کوشش کے! —— اُس کے سامنے بیلا کا جوان مرمریں

پیکر آ کھڑا ہوتا — گوپال کا قہقہے لگاتا ہوا چہرہ اُبھرنے لگتا......

گوپال کو بھی بیلا پسند تھی۔ وہ بھی اُس کا قرب چاہتا تھا — لیکن وہ ساری زندگی کے لیئے روگ پالنے کے حق میں نہیں تھا۔ اُسے بیلا کے گداز مرمریں جسم کی ضرورت تھی۔ اُس کے حُسن، اُس کی جوانی کی ضرورت تھی — صرف چند لمحے حسین بنانے کیلیئے۔

شام گوپال کی اس فطرت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گوپال کی زندگی میں کئی لڑکیاں اسی طرح آتی ہیں۔ صرف چند روز، چند لمحے کے ساتھ کیلیئے — شام یہ سب جانتا تھا — سب سمجھتا تھا — اور بیلا ہر لمحہ گوپال کے قریب ہوتی جا رہی تھی — اُس کی طرف کھنچ رہی تھی —

اُس نے اپنے روتے بلکتے ہوئے دل پر پتھر رکھ کر چاہا تھا کہ گوپال ہی سنبھل جائے اپنی اس لاابالی اور اوباش زندگی کو چھوڑ دے — بھنورے کی طرح ایک پھول کے بعد دوسرے پر نہ منڈلائے — ! اُس نے چاہا تھا کہ اپنی سسکتی بلکتی محبت کو دفنا کر بیلا کے لیئے ہی ساری مسرتیں جمع کر دے۔ اُسے گوپال کے ساتھ ہی سہی۔ لیکن ہنستا کھیلتا، مسکراتا ہوا دیکھے — بیلا کی خوشی کیلیئے وہ اپنا سب کچھ لٹا سکتا تھا لیکن وہ کچھ بھی نہ کر سکا — گوپال کی آوارگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

وہ خاموش ہو گیا! — گوپال کو سمجھانا بے سود تھا!

اُس نے بیلا کو سمجھانے کی کوشش کی — اُسے گوپال کی آوارگی کے متعلق بتایا — گوپال کے ارادے بتلائے۔

بیلا تلملا اُٹھی — "تم جلتے ہو — حسد کرتے ہو — کیونکہ میں نے تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا — میں کبھی بھی تم سے محبت نہیں کر سکتی۔"

بیلا کچھ بھی سننے کو تیار نہ تھی — شام اُسے سُنانا چاہتا تھا — لیکن میں تم سے محبت کی بھیک مانگنے نہیں آیا۔ میں......"

"میں جانتی ہوں لیکن کان کھول کر سُن لو کہ میں گوپال سے محبت کرتی ہوں۔"
"تم بھی یہ جان لو کہ وہ تم سے محبت نہیں کرتا۔" شام نے بھی جھلا کر جواب دیا۔
"نہ سہی۔ لیکن میں پھر بھی اُس سے محبت کرتی ہوں اور میں اُسے حاصل کر کے

رہوں گی۔" بیلا غصہ سے کانپ رہی تھی۔
شام اب ضبط نہ کر سکا اور نہ سُن سکا۔ لیکن پھر بھی نہایت ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔
"وہ خود تمہیں حاصل کرے گا بیلا۔ کیونکہ اُسے خود تمہاری ضرورت ہے
لیکن صرف تھوڑی دیر کیلئے۔ اپنائے گا نہیں کیونکہ وہ اس کا قائل ہی نہیں۔"
گوپال کے بارے میں بیلا ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتی تھی۔ شام بھی بھرا ہوا

تھا۔ کہتا چلا گیا۔
آج تم گوپال کے بارے میں کچھ بھی سُننے کو تیار نہیں ہو! آج میں گوپال کے
مقابلے میں ہار رہا ہوں بیلا! لیکن کل تم ہار جاؤ گی اور میں دیکھوں گا۔ تم روؤ گی۔ چلاؤ گی
لیکن بے سود۔ تب تمہیں کچھ بھی نہیں سوجھے گا۔ تم گھبرا اُٹھو گی۔ جب گوپال تمہیں
چھوڑ جائے گا۔ تم گھبرا کر موت کو آوازیں دو گی۔ جب تم محسوس کرو گی کہ تمہیں میری ضرورت
ہے۔ جب میں محسوس کروں گا کہ تمہیں میری ضرورت ہے! اور وہ تمہاری ہار ہو گی۔
آج میں ہار رہا ہوں۔ کل میں جیتوں گا۔ میں اُس کل کا انتظار کروں گا۔"

شام تھک گیا۔ خاموش ہو گیا۔
بیلا دن بدن اُس سے دور ہوتی گئی۔

وہ خاموش رہا۔
بیلا اب ہر وقت گوپال کے ساتھ نظر آتی۔ سارا سارا دن گوپال کے ساتھ اُسکی
کار میں گھومتی پھرتی۔ گوپال نے اُسے ایک نئی دُنیا سے روشناس کرا دیا تھا۔ جس میں ظاہری رکھ
رکھاؤ، آن بان اور تصنع تھا۔ جو شراب کے چند گھونٹوں کے بعد اپنے آپ ختم ہو جاتا تھا۔ یہ دُنیا

بیلا کیلئے نئی تھی۔ ماحول کچھ نیا نیا سا تھا۔ لیکن اُس کے اپنے سرمایہ دارانہ ماحول سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اُسی کا ایک حصّہ تھا۔ اُسی کا نکھرا ہوا روپ تھا۔ لیکن اس سے پہلے بیلا نے اندھیرے اُجالوں کی اس نگری کو نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے اس قدر قریب نہیں گئی تھی۔ یہاں آکر جیسے اُسے پرواز کیلئے وسیع آسمان مل گیا تھا۔

بیلا اسی ماحول کی متمنی تھی۔ جس میں کلب تھے ہوٹل تھے، خوبصورت ریستوران تھے آزاد اُڑیاں رقص تھے۔ غازہ اور لپ اسٹک کی تہیں تھیں ـــــ مصنوعی خوشبوؤں کا ایک سیلاب تھا۔ برہنگی کی حد تک پہنچی ہوئی عریانی تھی۔ اور جسموں کی آزادانہ نمائش۔!!

بیلا گوپال کے ساتھ اس فضا میں کھو گئی ـــ دن بھر اُس کے ساتھ ہوٹلوں ریستورانوں میں گھومتی۔ رات گئے تک کلبوں میں تتلی کی طرح اُڑتی تیرتی رہتی ـــ گوپال نے جیسے اُس پر جادو سا کر دیا تھا۔ وہ مسحور ہو کر رہ گئی تھی۔

گوپال نے اُسے نئی زندگی دے دی تھی۔ وہ ہر وقت اُس کی باہوں میں باہیں ڈالے چہچہاتی رہتی۔ کلب کی نیم عریاں فضاؤں میں دیر تک اُن کے قہقہے گونجتے رہتے مدھم سوئی سوئی سی روشنیوں، شراب کے بھبھوکوں اور سگریٹوں کے دھوئیں سے بھرے ہوئے رقص گھروں میں دیر تک گوپال کے ساتھ رقصاں رہتی۔ مصنوعی ماحول کے مصنوعی پن نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اب اُس کے چہرے کی قدرتی دلکشی غازہ اور لپ اسٹک کی تہوں میں دب گئی تھی۔ جو کلب سے واپسی کے وقت تک کئی جگہ سے اُکھڑ چکی ہوتیں۔ اور کلب کی داستانوں کی چغلی کھاتی ہوتیں۔

شیام یہ سب دیکھتا ـــ اپنی ننھی مُنّی سی خوابوں کی پری کو اس تیزی سے آگ کی طرف لپکتے ہوئے دیکھ کر اُسے افسوس ہوتا ـــ مگر وہ اپنے دُکھ کو اندر ہی اندر دبا دیتا۔ مسکرانے کی کوشش کرتا کہ بیلا خوش تھی۔ اُسے جیسے دونوں عالم کی دولت مل گئی تھی۔ گوپال نے اُس کو اُن راہوں پر چلنا سکھا دیا تھا۔ جن پر شیام اُسے کبھی خواب میں بھی نہ لے جا سکتا تھا۔

بیلا اپنی ضدی طبیعت کے ساتھ ہی ساتھ بڑی جذباتی بھی تھی۔ گوپال کو حاصل کرنے کے لیئے وہ سب کچھ لٹا سکتی تھی۔ اُسے گوپال سے والہانہ محبت تھی۔ وہ اُسے اتنا ہی چاہتی تھی، جتنا کہ شام اُسے چاہتا تھا۔ لیکن گوپال دوسری ہی راہوں پر چل رہا تھا۔ بیلا نے اُسے پانے کیلئے اپنا سب کچھ ہار دیا تھا۔

بیلا جانتی تھی کہ شام کی یہ ویرانی، یہ خاموشی، یہ اُکھڑی اُکھڑی سی باتیں، سب اُسی کی دین ہیں، وہ جانتی تھی کہ شام اُس سے پاگل پن کی حد تک محبت کرتا ہے۔ کبھی کبھی اُسے شام پر ترس آنے لگتا تھا۔ اُس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ساتھ کھیلے تھے۔ کتنا معصوم:۔ کتنا الھڑ؟؟ لیکن وہ گوپال کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ شام اُس کے خوابوں کا لڑکا نہیں تھا۔ سیدھا سادہ جذباتی سا نوجوان تھا۔ جو اُس کی وجہ سے مُرجھا سا گیا تھا۔ — وہ کبھی کبھی سوچتی — اگر گوپال اُس کی زندگی میں نہ آتا؟ — اگر وہ گوپال سے نہ ملی ہوتی — ؟ تو ....؟؟

وہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی سر جھٹک دیتی... اور اپنی کار میں بیٹھ کر گوپال کی طرف چل دیتی! —

•••

گوپال جیسے آدمی کے لیئے زیادہ دیر تک ایک ہی جگہ ٹکا رہنا ناممکن تھا۔ شروع ہی سے بڑا متلون مزاج تھا۔ ایک ہی کھلونے سے کھیلتے رہنا اُس کی طبیعت کے خلاف تھا۔ وہ ایک چیز لیتا، کچھ دن اُس کے ساتھ کھیلتا، بڑے جوش کے ساتھ اُسے اُٹھائے اُٹھائے گھومتا۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد اُس سے اُکتا جاتا — سیر ہو جاتا — پھر اُسے پھینک دیتا۔ اس طرح الگ کر دیتا جیسے اُس چیز کو کبھی اُس کی زندگی میں داخل ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا — یہ اُس کی بچپن کی عادت تھی۔

بیلا سے بھی وہ اُسی جوش، اُسی ولولہ سے ملا تھا۔ اُسی شوق کے ساتھ اُس کے قریب آیا تھا — ہر وقت اُس کے ساتھ رہتا۔ ایک منٹ کی علیحدگی بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب اُس کی طبیعت بھر چکی تھی — وہ اُکتا سا گیا تھا۔ اب اُسے بیلا کی موجودگی سے وحشت ہونے لگتی تھی۔

بیلا اور گوپال کی ملاقاتیں آہستہ آہستہ کم ہونے لگیں۔ کبھی روز ملتے تھے

مگر اب کئی کئی دن گزر جاتے۔ کہیں راستہ میں ملاقات ہو بھی جاتی تو گوپال جیسے بیلا سے بچ کر کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ بیلا جھنجھلا جاتی۔

شام نے انھیں قریب آتے بھی دیکھا تھا۔ اب ان کم ہوتی ہوئی ملاقاتوں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ ان کا مطلب سمجھتا تھا۔ لیکن خاموش تھا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتا۔ مگر کچھ نہ کر سکتا۔

اور ایک دن گوپال کہیں غائب ہو گیا — جانے سے پہلے شام سے ملا۔ بچپن کا ساتھ تھا۔ اب تک نبھتا آیا تھا۔ اور گوپال نہ جانے کب لوٹتا۔ یا لوٹتا بھی کہ نہیں؛ شام نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ نہیں مانا —

"میرے دوست! میرے نزدیک عورت محض چند لمحوں کی رفیق ہے۔ میں ہمیشہ کیلئے روگ نہیں پال سکتا —"

"مگر بیلا ......" شام نے کچھ کہنا چاہا — لیکن گوپال نے اس کی مہلت نہیں دی —

"بیلا بھی ایک عورت ہی ہے۔ ایک عام سی لڑکی ہے —!"

"لیکن بیلا تو تم سے محبت کرتی ہے۔ تمھارے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے —"

"تم بھی تو اُس سے محبت کرتے ہو۔ کیا تم نے اُسے پا لیا؟" —

"نہیں! لیکن اگر تم ......"

لیکن گوپال نے پھر اُس کی بات کاٹ دی —

"اگر مگر کچھ نہیں۔ مجھے اُس کی ضرورت تھی۔ میں نے اُسے حاصل کر لیا۔"

"لیکن اُس کو تو اب بھی تمھاری ضرورت ہے۔"

"لیکن مجھے اب اُس کی ضرورت نہیں۔ پھر وہ تو مجھے پا بھی چکی ہے وقتی طور پر۔

ہی سہی ــــ لیکن میں نے اُسے ٹھکرایا تو نہیں ــ اُسکی محبت کا جواب محبت ہی سے دیا ہے۔"

شام خاموش رہا۔ اُس کے پاس اِس کا کوئی جواب نہ تھا ــــ تھوڑی دیر کے بعد بولا ــــ

"لیکن جانے پہلے بیلا سے مل تو لیتے ــ!"

گوپال نے کوئی جواب نہیں دیا چُپ چاپ چلا گیا ــــ جانے سے پہلے بیلا سے نہ مِلا ــــ شام نے ہی اُسے بتایا کہ گوپال بھاگ گیا ہے۔ اب کبھی نہیں لوٹے گا! لیکن بیلا کو شام کی بات پر اعتبار نہیں آیا۔ گوپال شہر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اُس سے مِل کر بھی نہیں گیا تھا ــــ کوئی ضروری کام آپڑا ہوگا ــــ دو چار دن میں لوٹ ہی آئے گا۔ کوئی ایسی ہی فوری ضرورت آپڑی ہوگی ورنہ اُس سے مِل کر نہ جاتا ــــ گوپال کی کم ہوتی ہوئی ملاقاتوں کو وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔ اُس کی اُکتاہٹ سے بھی بے خبر نہیں تھی۔ لیکن اُسے یقین تھا کہ گوپال اُسے اِس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

وہ انتظار کرتی رہی۔ ہفتوں اُس کی راہ دیکھتی رہی۔ لیکن گوپال نہیں لوٹا ــــ بیلا نے اُن تمام ہوٹلوں اور کلبوں کو چھان مارا ــــ جہاں دونوں نے ایک ساتھ کئی شامیں گزاری تھیں ــــ دور و نزدیک کے شہروں میں بھی تلاش کر آئی۔ گوپال جیسے صفحۂ ہستی سے ہی اُڑ گیا تھا ــــ وہ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا؟ لیکن وہ نا اُمید نہیں ہوئی۔ برابر اُس کی راہ دیکھتی رہی ــــ

ایک مہینہ گذر گیا ــــ

گوپال نہیں آیا ــــ

دو مہینے گذرنے گئے ــــ

بیلا کا یقین ڈگمگانے لگا ــــ!

گوپال نہیں لوٹے گا ــــ!

بیلا مایوس ہوگئی۔ اُس کے غرور کو پہلی مرتبہ ٹھیس لگی تھی۔ آج تک اُس نے مایوسی کی شکل نہیں دیکھی تھی ــــــ وہ صرف اپنی بات منوانے کی عادی تھی۔ اُس کے ایک ایک اشارے پر گھر کے لوگ بچھ بچھ جاتے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں ناراضگی دیکھتے ہی سب کا رنگ اُڑ جاتا ــــــ اُس کی ہر خواہش پوری ہوتی تھی۔ اُس نے اب تک جو کچھ چاہا اُسے حاصل کر کے رہی۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اُس کی پسند اُس کے ہاتھوں سے چھن گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ــــــ! وہ برداشت نہ کر سکی۔ ملبلا اُٹھی ــــــ شام کا کہنا سچ ہو رہا تھا۔ گوپال واقعی اُسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔

گوپال کو گئے تین مہینے ہو چکے تھے۔ بیلا اب تک اپنے مایوس دل کو تسلی دیتی آرہی تھی۔ کہ عنقریب ہی گوپال یا اُس کا کوئی خط ہی آجائے گا اور اپنے اس طرح چلے جانے کی معافی مانگے گا۔ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنا لے گا۔ لیکن ہر اُمید ٹوٹ رہی تھی کلبوں، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں گوپال کے ساتھ گذارے ہوئے لمحے اپنے پاؤں پھیلانے لگے تھے ــــــ لیکن اُسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی ــــــ کوئی افسوس نہ تھا ــــــ اُس کے باپ کی تجوری میں پڑے ہوئے کاغذوں کے چند ٹکڑے اُس کو اِس بوجھ سے نجات دلا سکتے تھے ــــــ روپیہ ہر مرض کا علاج کر سکتا ہے۔ لیکن گوپال کے اس طرح چھوڑ جانے پر اُس کے دل کو جو ٹھیس لگی تھی۔ روپیہ اُس کا مداوا نہ تھا ــــــ زندگی میں پہلی بار اُسے شکست ہوئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُسے اپنی محرومی کا احساس ہوا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اُس نے کچھ کھویا تھا۔ اُس سے چھین لیا گیا تھا ــــــ وہ اس کیلئے تیار نہیں تھی۔

اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے بیٹھے سوچتی ــــــ گوپال نے اُس سے کتنا دھوکا کیا تھا؟؟ کتنے ہی نوجوانوں نے اُس کے لئے راہ میں آنکھیں بچھائی تھیں۔ اُس کے کالج کے کتنے ہی ساتھی اُس کیلئے رات دن تڑپتے تھے ــــــ اُسے دیکھ کر آہیں بھرتے تھے۔ اُسکی

ایک نگاہِ غلط انداز کیلئے ترستے رہتے تھے ___ !

شام تھا ___ جو اپنا سب کچھ ہار چکا تھا ___ ! اُس کی بے رُخی کے باوجود اُسے چاہتا تھا ___ ! اُس کی بے اعتنائی کے باوجود اُس کے لئے جان تک دینے کو تیار تھا ___ ! لیکن وُہ اُس نے کسی کو بھی قابل اعتنا نہ سمجھا ___ کسی کی محبت کی قدر نہ کی۔! صرف گوپال کی وجہ سے !! ___

اُسے گوپال سے کتنی محبت تھی ! ___

اور وہ اُسے چھوڑ گیا تھا !! ___

جذباتی سیلا یہ ذلت برداشت نہ کر سکی ___ ! وہ اب کسی کو مُنہ نہ دکھا سکتی تھی۔ رہ رہ کر اُس کے سامنے شام کی تصویر آ کھڑی ہوتی ___ اُس کے کانوں میں شام کے الفاظ گونجنے لگتے ___

..... آج میں ہارا ہوں ___ کل تم ہار جاؤ گی ! ___ کل میں تمہیں شکست دوں گا' جب گوپال تمہارا ساتھ چھوڑ جائے گا ___ تم اکیلی اندھیروں میں بھٹکتی رہ جاؤ گی ___ تم دھاڑیں مار مار کر رونا چاہو گی ___ رو نہ سکو گی ___ سہارا ڈھونڈو گی ___ گوپال کو تلاش کرو گی ___ لیکن گوپال نہیں ہوگا ___ جب تمہیں میری ضرورت محسوس ہوگی ___ جب تمہیں میری ضرورت محسوس ہو گی ...."

اب اُسے واقعی سہارے کی تلاش تھی ___ اُسے واقعی شام کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ شام کا آخری فقرہ اُس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔

اُس نے اپنے دونوں کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیں۔ اور چیخ اُٹھی ___

"نہیں ! ___ ہرگز نہیں !! ___"

اُس نے اُسی طرح سر کو تھامے کمرے سے باہر جھانکا ___ اُس کے چہرے پر ایک کربناک سکون چھا گیا تھا۔ اُس نے موت سے ملنے کا فیصلہ کر لیا تھا ___ !

آسمان صبح ہی سے ابر آلود تھا۔ بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ایک دوسرے میں ضم ہو کر سورج کی تیز شعاعوں کو زمین تک پہنچنے سے روک رہے تھے دوپہر کا وقت تھا۔ لیکن بادلوں کی وجہ سے ابھی سے شام سے دھندلکے ہر طرف پھیلنے لگے تھے۔ ہوا میں ایک ٹھنڈک سی آ گئی تھی۔ تھم سی گئی تھی۔ جیسے رُک کر گہری سوچ میں گم ہو گئی ہو ___ گھنے سرمئی بادلوں کے بیشمار ٹکڑے دور خلاؤں میں آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔ عجیب عجیب شکلیں بنا بگاڑ رہے تھے۔

شام نے تاریک ہوتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا ___ ، بادل سمٹتے پھیلتے ایک دوسرے میں تحلیل ہو رہے تھے! ___ ایک نظر اپنے گھر کے سامنے چلنے والی سڑک پر ڈالی ___ بے شمار لوگ، بے شمار گاڑیاں، تانگے، موٹریں اِدھر سے اُدھر آ جا رہی تھیں۔ سب کسی نہ کسی طرف، کسی نہ کسی کے پاس جا رہے تھے۔ اُس کا جی بے اختیار بیلا سے ملنے کو چاہنے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی طرف جائے ___ اُس سے ملے وہ جانتا تھا کہ سب بے سود ہے: لاحاصل ہے ___ بیلا اُسے کبھی نہیں مل سکتی

اُس کی محبت کا جواب کبھی محبت سے نہیں دے سکتی ۔ لیکن پھر بھی وہ بیلا سے ملنا چاہتا تھا ۔ صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا ۔

اُس نے جلدی سے کپڑے بدلے اور بیلا کی طرف چل دیا ۔ آسمان پر کبھی کبھی زور سے بجلی کڑکنے لگی تھی ، بادل گرجنے لگے تھے ۔ اُس نے تقریباً بھاگتے ہوئے سڑک پار کی اور بیلا کے مکان میں داخل ہو گیا ۔

بیلا کی حویلی خالی تھی ـــــ سب لوگ شاید اکٹھے ہی کہیں گھومنے گئے ہوئے تھے گھر میں کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا ۔ شام راہداری سے گذرتا ہوا بیلا کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا ـــــ بادل ایک بار پھر زور سے گڑگڑائے ۔ شام کمرے میں داخل ہوا ۔ بیلا کھڑکی کے پاس کھڑی باہر جھانک رہی تھی ۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا ـــــ

اُس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں ـــــ سوجی ہوئی تھیں ! ـــــ نہ جانے کب سے وہ کھڑکی میں کھڑی باہر دیکھ رہی تھی ! ـــــ کب سے اُس کی آنکھیں خلائیں گھور رہی تھیں ؟ کسی کی راہ دیکھ رہی تھیں ! شام کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اُس نے جلدی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنا ایک ہاتھ آنچل میں لپیٹ کر پیچھے کر لیا ۔ اور بولی ۔

"کیوں آئے ہو ـــــ ؟" اُس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی ۔

شام نے ایک نظر اُس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں پر ڈالی ، ـــــ اُس کی سرخ ویران آنکھوں میں جھانکا ، ـــــ وہاں کچھ بھی نہیں تھا ، ـــــ جیسے اُنھیں اپنی زندگی کا احساس ہی نہ ہو ! ـــــ شام کا دل رو اُٹھا ـــــ اُس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا ـــــ یہ وقت رونے کا نہیں تھا ـــــ

"دیکھنے چلا آیا ـــــ"

"کیا دیکھنے آئے ہو ؟"

شام نے اپنی کہی ۔

"گوپال چلا گیا بیلا! اب وہ کبھی نہیں آئے گا!"

"وہ آئے یا نہ آئے لیکن تم ایشور کیلئے تنہا رہنے دو مجھے"۔

شام نے اپنی بات جاری رکھی ــــــ "تمھارے دُکھ کو جانتا ہوں۔ لیکن آج میں تم سے محبت کی بھیک مانگنے نہیں آیا۔ میں صرف اس لئے آیا ہوں کہ ....."

بیلا شیرنی کی جھپٹ پڑی۔

"میں کہتی ہوں تم چلے جاؤ ــــــ ! مجھے تمھارے سہارے کی ضرورت نہیں"۔ میں کسی کا سہارا لینے سے پہلے ہی مرجانا پسند کرتی ہوں! ــــ یہ دیکھو! ــــ میں اسکے لئے پہلے ہی سے تیار ہوں۔ اگر کچھ دیر ٹھہر کر آتے تو میں جا چکی ہوتی ــــ تمھاری صورت دیکھنے سے پہلے ہی مر گئی ہوتی۔ لیکن اب میں تمھارے سامنے ہی مروں گی۔ تمہیں پھر شکست دوں گی ــــ"

بیلا نے اپنا آنچل میں لپٹا ہوا ہاتھ نکال کر شام کے سامنے کر دیا۔ جس میں کاغذ کے ایک ٹکڑے میں لپٹا ہوا مہلک زہر تھا ــــ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی ــــ وہ آخری بار شام کو آخری شکست دے رہی تھی۔ اُس کے بے جان سے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ــــ لیکن شام نے اُسے زندگی اور موت کی درمیانی حدود پھلانگنے سے پہلے ہی پکڑ لیا ــــ، تیزی سے آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھوں سے زہر کی پڑیا چھین لی ــــ اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی رینگ گئی ــــ

"لیکن تم نہیں مروگی ــــ! میں جانتا ہوں کہ تم مرنا نہیں چاہتی۔ تم زندگی سے ہارنا نہیں چاہتیں ــــ تم نے کسی سے ہارنا سیکھا ہی نہیں!"

کمرے کے باہر بادل زور سے گرجے، بجلی زور سے تڑپی ــــ اور پھر زور زور سے بارش ہونے لگی ــــ شام نے بیلا کی طرف دیکھا۔ وہ مایوس سی ہو کر ایک کرسی میں گر گئی تھی ــــ ایک نظر باہر روتی ہوئی کائنات پر ڈالی۔ پھر زہر کی وہ پڑیا باہر پھینکتے ہوئے

پانی میں اُچھال دی ـــــ اور مُڑ کر بیلا کی طرف دیکھنے لگا ـــــ !؟ ـــــ بیلا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ لیکن جیسے اُسے اس کا احساس ہی نہیں تھا۔ وہ جیسے کسی اور ہی دُنیا میں پہنچ چکی تھی۔ شام نے آگے بڑھ کر اُسے جھنجھوڑا ـــــ بیلا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اور پھر سسک سسک کر رونے لگی۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں مرنے دیا ـــــ؟"

"دوریاں اچھی ہیں بیلا! ـــــ میں دوری برداشت کرسکتا ہوں۔ لیکن موت بڑی بھیانک ہے۔ میں تم سے اپنے لئے کچھ نہیں مانگتا۔ لیکن میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا ـــــ! کبھی نہیں!!"

بیلا نے اپنے آنسو پونچھ لئے! شام کی بے لوث محبت کو جانتی تھی۔ اُس کی محروم، اُداس زندگی سے واقف تھی، ـــــ اُسے اس کا افسوس بھی تھا۔ رُک رُک کر بولی۔

"میں بھی سب جانتی ہوں۔ مجھے اس کا احساس ہے، لیکن، ..... لیکن ..... اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ کاش گوپال ......"

لیکن وہ اپنا فقرہ مکمل نہ کرسکی۔ شام نے اُسے ڈھارس دی ـــــ

"مجھ پر یقین رکھو ـــــ میں تمھارے گوپال کو ڈھونڈھ لاؤں گا ـــــ میں خود اُسے تمھارے حوالے کردوں گا ـــــ مجھ پر یقین رکھو بیلا ـــــ!"

اُس کی اپنی آواز بھی بھاری ہونے لگی تھی۔

بیلا نے پھر سسکی بھری ـــــ "کاش تم نے مجھے مر جانے دیا ہوتا ـــــ!"

بیلا کسی سحر زدہ ہستی کی طرح خاموشی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ـــــ باہر بڑے زوروں سے پانی برسنے لگا تھا۔ جیسے آسمان اپنے دل کا سارا غبار دھو ڈالنا چاہتا ہو۔ شام نے کمرے میں ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی ـــــ بیلا منہ دھونے کے لئے جا چکی تھی شام نے اپنی پلکوں پر آئے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا اور خاموشی سے واپس چلا آیا۔

شام کیلئے اب اپنے شہر میں کوئی کشش نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اس اُکتا آمیز قرب سے اُوب سا گیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اس نزدیکی سے تو دوری بہتر ہے ـــ وہ اپنے پہاڑوں، اپنی دھرتی، اپنے لوگوں سے دور چلا جائے ـــ جہاں آہستہ آہستہ بہنے والی یہ ندی نہ ہو۔ یہ گہری گہری ڈھلکیاں نہ ہوں، ـــ چناب سے نکلنے والی تیز رو نہر نہ ہو۔ اُس کا ٹھنڈا یخ، ٹھاٹھیں مارتا ہوا اُڑتا ہوا پانی نہ ہو ـــ جو رہ رہ کر اُس کی یادوں کو کریدتا ہے۔ ان کی موجودگی میں وہ ان حسین تلخ لمحوں کو کسی وقت بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا ـــ جو اُس نے ان کے چپے چپے پر گذارے تھے۔

جانے سے پہلے اُس نے سوچا ـــ کیوں نہ ایک بار آخری بار بیلا کو دیکھ آیا جائے۔ وہ بیلا ہی کی نظروں سے اوجھل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن ایک دفعہ پھر اُسے دیکھنے کی خواہش کو نہ دبا سکا ـــ

بیلا اپنے ڈرائنگ میں اپنے پاپا کے پاس بیٹھی تھی۔ اُس کے دوسری طرف

صوفہ کے بازو پر اُس کا چھوٹا بھائی بیٹھا تھا ۔۔۔ ' دُبلا، پتلا، زرد رو سا لڑکا ' ۔۔۔ سفید قمیص اور خاکی پتلون پہنے عجیب لاپرواہی سے بیٹھا تھا۔ اُس کے لمبے لمبے خشک سیاہ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس نفیس حویلی کے ڈرائنگ روم میں اجنبی سا لگتا تھا ۔۔۔ جیسے وہ اس حویلی کا مکین ہی نہ ہو ۔۔۔ ... جیسے یہ اُس کا اپنا گھر نہ ہو۔ کسی دوسرے شخص کا مکان ہو۔ جہاں وہ صرف تھوڑی دیر، صرف چند لمحوں کیلئے کسی سے ملنے چلا آیا ہو ۔۔۔

سولہ سترہ برس کا یوگ، بیلا کا بھائی ہوتے ہوئے بھی اُس سے کتنا مختلف تھا۔ اُسے جیسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ ایک دولتمند باپ کا بیٹا ہے۔ اُس کو وہ غرور، وہ نخوت چھو بھی نہیں گئی تھی جو اس کے ماحول کیلئے ضروری بن چکی تھی۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھیں نہ جانے ہر وقت کیا سوچتی رہتیں، کیا تلاش کرتی رہتیں؟؟ ۔۔۔ نہ جانے وہ کون سی دُنیا کا باسی تھا ۔۔۔ کون سی دُنیا میں کھویا رہتا تھا ۔۔۔ ؟

شام کو یوگ سے بڑی محبت تھی۔ دونوں کی طبیعتوں میں بڑی یکسانیت تھی، دونوں کی عمروں میں بھی زیادہ فرق نہیں تھا اس لئے دونوں گھنٹوں اکٹھے بیٹھے رہتے تھے۔ باتیں کرتے رہتے تھے ۔۔۔ دونوں جیسے ایک دوسرے کی تصویر تھے۔

سوچیں دونوں کی عادت بن چکی تھیں۔ اور سوچوں نے یوگ کے چہرے پر اس چھوٹی سی عمر میں ہی بڑھاپے کی متانت اور سنجیدگی بکھیر دی تھی، وہ شام کے ہر راز سے واقف تھا۔ اُس کی ہر بات جانتا تھا اور اُس سے بے حد پیار کرتا تھا۔

یوگ کی ماں بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ تب وہ ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی نہیں سیکھا تھا ۔۔۔ جب ہوش سنبھالا تو بڑی دو بہنیں سسرال جا چکی تھیں، اُن دونوں سے چھوٹی اوشا تھی ۔۔۔ اور چوتھی بیلا۔ لیکن اس بھرے پُرے گھر میں کسے فرصت تھی کہ اُس کی سُن سکے ۔۔۔ اپنی کہہ سکے ۔۔۔ نوکروں ہی کی گود میں پلا تھا۔ اس لئے

نہیں جانتا تھا کہ ماں کی آغوش یا بہن کی محبت کیا ہوتی ہے ـــــ

شام اور یوگ دونوں ہی بد قسمت تھے ـــــ دونوں ہی زخمی تھے ـــــ.....

دونوں ہی مرہم کی تلاش میں تھے، جو اُن کی سسکتی بلکتی روحوں کو تسکین دے سکے۔

ان میں سے ایک پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار کے یہاں قید تھا۔ پھڑپھڑا رہا تھا۔

اور دوسرا شہر چھوڑ کر جانے کی تیاری کر رہا تھا ـــــ یوگ کبھی کبھی جھنجھلا جاتا۔ اپنی

بوجھل پلکیں اُٹھا کر جھلّائے ہوئے انداز میں کہتا ـــــ

"شام جی! ہمیں یہ دُنیا خالی ہی کر دینی چاہیئے ـــــ! یہ دُنیا ہم جیسے لوگوں

کیلئے نہیں ہے۔ ہم اس میں رہنے کے قابل ہی نہیں ہیں ـــــ"

اُس کی آواز میں بلا کا درد، بلا کی یاسیت اور بے انتہا کرب ہوتا۔

شام کو ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھ کر اُس کے ویران آنکھوں میں ایک

بُجھی بُجھی سی چمک آگئی ـــــ وہ ایک دم کھل سا اُٹھا۔ اور اپنے مخصوص انداز میں چہکا۔

"آؤ ـــــ بڑے دنوں بعد درشن ہو رہے ہیں ـــــ"

"نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں ـــــ" شام نے زبردستی مسکرانے کی

کوشش کی ـــــ یوگ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ اُبھری۔

"میں سب جانتا ہوں ـــــ بتاؤ آج کدھر بھول پڑے ـــــ؟"

"بس یونہی ملنے چلا آیا۔ سوچا۔ نہ جانے پھر کب ملاقات ہو؟ ـــــ ایک

نظر دیکھ آؤں ـــــ" اُس نے کنکھیوں سے بیلا کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کہیں باہر جا رہے ہو؟" ٹھیکیدار صاحب کی مخصوص، محتاط آواز تھی۔

"جی ہاں! کل یا پرسوں صبح چلا جاؤں گا ـــــ!"

"اچھا جب آؤ تو ضرور ملنا۔" یہ کہتے ہوئے پنڈت پیارے لال باہر چلے

گئے۔ یوگ نے اطمینان کی سانس لی۔ بیلا خاموش بیٹھی رہی جیسے اُسے کسی کی

موجودگی کا احساس ہی نہ ہو'۔

شام نے اپنی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اُس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ وہ اُسے جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔

یوگ نے بات چھیڑی ـــــ

"باہر جا رہے ہو؟"

"ہاں ـــــ!"

"کہاں؟"

"یہ نہیں معلوم، کہیں بھی چلا جاؤں گا ـــــ" شام جیسے کہیں بہت دور سے بول رہا تھا۔

بیلا نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا۔ جیسے وہ ابھی ابھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا ہو۔

"کیوں ـــــ؟"

بیلا نے اپنے وجود کا ثبوت دیا۔

"بس اس شہر سے نکل جانا چاہتا ہوں .... کہیں بھی .... کسی طرف بھی ....!"

"یہاں دل نہیں لگتا؟" بیلا نے پھر سوال کیا۔

شام کوئی جواب نہ دے سکا ـــــ اُس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اُس کی نظروں کی تاب نہ لا سکی ـــــ خاموشی سے اُٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔

شام ابھی تک اُس دروازہ کی طرف دیکھ رہا تھا جس سے ابھی چند لمحے پہلے بیلا گذری تھی ـــــ اُس نے مُڑ کر یوگ کی طرف بڑی پیار بھری نظروں سے

دیکھا ــــ جس کی آنکھوں میں اُس کے غم سے آنسو ڈُ امڈ آئے تھے۔ پھر اُس کا کندھا
تھپتھپاتے ہوئے بولا ــــ
"مجھے بھولنا نہیں ــــ !"

•••

بیلا کے گھر سے آنے کے بعد اپنے شہر سے رہی سہی محبت بھی ٹوٹ گئی تھی ـــ وہ اپنے دھرتی پر اپنے ہی لوگوں میں اجنبی سا بن کر رہ گیا تھا۔ اُس کے والدین جو اُس کی ذہانت، اُس کی سعادت مندی اور چُست طبیعت کے باعث اُسے اپنے لئے فخر کا باعث سمجھتے تھے، اب اُس سے نالاں رہنے لگے ـــ گھر میں اب اُس کی موجودگی یا غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ کب باہر گیا۔ کب گھر لوٹا ـــ ؟ اُس نے کچھ کھایا یا نہیں ـــ اب کسی کو ان باتوں کا فکر نہیں تھا ـــ ایک بھولو چاچا تھا۔ جو خود اُسی کی طرح گھر کا ایک فالتو شخص تھا۔ بھولو چاچا! ـــ جو اپنی اس بوڑھی عمر میں بھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتا ـــ اور پھر اپنی گڑگڑی لے کر اپنی کوٹھڑی میں دُبک جاتا تھا۔ وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی جیسے گھر میں نہیں تھا۔ اُس کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔

شام اُس رستے بستے شہر کے ایک بھرے پُرے گھر میں اکیلا تھا ـــ اتنی وسیع کائنات میں اُس کا کوئی رفیق، کوئی ساتھی نہ تھا ـــ وہ جیسے ایک غیر ضروری

پرزہ تھا۔ جو کہیں بھی فٹ نہیں ہو سکتا۔

اُسے اپنی تنہائی بُری طرح کھٹکنے لگی۔ اب اُس کی زندگی کے سفر کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ تھوڑا بہت بچا کھچا سرمایہ تھا، اور بھولو چاچا ــــ جسے نہ بزرگ اپنے ساتھ دوسری دُنیا میں لے گئے تھے اور نہ ہی دھرتی کی گود میں ابدی نیند سونے کیلئے کوئی چھوٹا سا کونہ مل سکا۔

شام نے اپنی تمام پونجی اکٹھی کی۔ ایک چھوٹے سے اٹیچی کیس میں دو چار جوڑے کپڑوں کے رکھے، اور جانے کیلئے تیار ہو گیا۔ رات تاریک اور بھیانک تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں سوئے پڑے تھے۔ صرف بھولو چاچا کے کمرے سے کبھی کبھی حقہ پینے کی گڑگڑ، یا اُس کی بے ہنگم بلغمی کھانسی کی آواز آ رہی تھی۔ شام نے اٹیچی کیس ہاتھ میں لیا۔ اور دبے پاؤں سیڑھیاں اُترنے لگا۔

بھولو چاچا کی تاریک کوٹھڑی کے سامنے پہنچ کر وہ ذرا دیر کیلئے رُکا۔ پھر دروازہ کو دھکا دے کر اندر داخل ہو گیا۔ بوڑھے بھولو چاچا نے دروازے کی چرچراہٹ سُن کر نظریں اُٹھائیں۔ شام کے ہاتھوں میں اٹیچی کیس دیکھ کر حیران رہ گیا۔ گھر میں صرف وہی ایک فرد تھا۔ جسے اب بھی شام سے محبت تھی۔ جو اب بھی شام کو اُسی طرح چاہتا تھا، جیسے وہ پانچ چھ سال کا بچہ ہو۔

شام نے اپنی جیب سے ایک پوٹلی سی نکالی۔ اور بھولو چاچا کے سامنے رکھ دی بھولو چاچا نے ایک نظر پوٹلی پر ڈالی۔ پھر شام کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ کیا ہے ؟"

شام بھولو چاچا کے ان سیدھے سادے سوالوں پر ہی بوکھلایا کرتا تھا ــ جھجکتے ہوئے بولا۔

"تم رکھ لو ــــ"

بھولو چاچا نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"لیکن یہ سب ہے کیا؟"

شام رُک رُک کر بولا ــــ

"تھوڑے سے پیسے جمع کئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو میں اپنے ساتھ لئے جا رہا ہوں۔ گاڑی کے ٹکٹ وغیرہ کے لئے، باقی تم رکھو۔ تمھارے کام آئیں گے اب ان بوڑھی ہڈیوں کو کچھ آرام بھی کرنے دو!"

بھولو چاچا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گڑگڑی ہاتھ سے رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن تم جا کہاں رہے ہو؟"

شام اس کی آنسوؤں بھری آنکھوں میں ڈوب گیا۔ زبان بند رہی۔

بھولو چاچا سب جانتا تھا۔ شام کو گود میں کھلایا تھا۔ اُس کی نس نس سے واقف تھا۔ لیکن شام اکیلا جا سکتا ہے، یہ اُس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا ــــ اُس کی نگاہوں میں وہ ابھی تک ایک کمسن بچہ ہی تھا۔ جو اپنی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتا! کہنے لگا ــــ

"لیکن تم اکیلے کیسے جا سکو گے؟ ــــ وہاں تمھاری دیکھ ریکھ کون کرے گا۔"

شام اُس کی یہ بات سُن کر اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

"بھولو چاچا! تم سچ مچ بھولے ہو۔ بھلا میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں ــــ؟"

لیکن بھولو چاچا کے لئے یہ دلیل بے معنی تھی جھڑک کر بولا۔

"نہیں تم تو مجھ سے بھی بوڑھے ہو۔ ابھی تک یہ تو جانتے نہیں کہ کب بھوک لگ رہی ہے اور کب پیاس! کہہ کہہ کر تو کھلانا پڑتا ہے۔ چلا ہے وہاں سے اکیلا تیر مارنے ــــ!" بھولو چاچا اپنی بات پر خود ہی ہنس دیا۔

"اسی لئے تو کہتا ہوں بھیا کہ جُونی جلنے والی باتیں کیا کرو۔ ہونے جلنے والی ــــ! یہ بچپنا اب تمہیں اچھا نہیں لگتا۔"

لیکن شام کیسے رُک سکتا تھا؟ بولا۔

"ہونے جینے کیلئے ہی تو جانا چاہتا ہوں۔"

اُس کا گلا رُندھ گیا۔ بھولو چاچا کو یقین ہو گیا کہ شام نہیں رُکے گا۔ وہ فوراً اُٹھا اور اپنا وردی کا کوٹ اور پتلون نکالا۔ بستر کی چادر کو دُہرا کر کے کندھوں پر رکھا اور اپنی چھاری ہاتھوں میں پکڑ کر بولا۔

"تو چلو۔ میں بھی تمھارے ساتھ چلتا ہوں!"

"لیکن تم...... تم میرے ساتھ کہاں جاؤ گے؟" شام بوکھلا سا گیا۔

"جہاں تم جا رہے ہو اور کہاں!"

لیکن بھولو چاچا! میرا کیا ٹھکانہ ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں بھٹکوں گا۔ تم اپنی بوڑھی ہڈیوں کو میرے ساتھ کہاں کہاں گھسیٹتے پھرو گے! — یہ عمر تمھاری دربدر ٹھوکریں کھانے کی نہیں، — آرام کرنے کی ہے۔"

"لیکن بھولو چاچا اُسے اکیلا جانے دینے پر تیار نہ ہوا۔ اپنی سفید داڑھی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"بھیّا! یہ سفید بالوں پر نہ جاؤ — اب بھی سو جوانوں پر بھاری ہوں۔ تمھارے زمانے کی کچی ہڈیاں نہیں ہیں!"

شام نے ایک اور چال چلی — اچھا تو یوں کرو۔ ابھی تم یہیں رہو۔ کوئی اپنا ٹھکانہ بنتے ہی تمہیں بلا لوں گا۔ یہاں کم از کم سر چھپانے کی جگہ تو ہے تمھارے پاس!

بھولو چاچا سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ رُندھی ہوئی آواز میں بولا۔

"شام بابو! — ابھی تک صرف تمھاری وجہ سے اس گھر میں ٹکا ہوا ہوں۔ تمھیں اپنے بچے کی طرح پالا ہے۔ اگر تم چلے گئے تو میں اکیلا دو ہی دن میں مر جاؤں گا —!"

شام کو اس بوڑھے ملازم کے خلوص اور محبت کو دیکھ کر ترس آنے لگا۔ لیکن وہ اسے اپنے ساتھ کہاں لئے لئے پھرتا — باہر پردیس میں جہاں اپنا بیگانہ کوئی نہ تھا، اُسے اپنا

بوجھ اُٹھانا بھی مشکل نظر آتا تھا۔ پھر اُس کا بوجھ کیوں کر سنبھال سکتا۔؟ بھولو چاچا ساتھ جانے پر بضد تھا۔ لیکن شام نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ساتھ اُسے بھی خوار کرے۔ جب بحث مباحثے سے کچھ کام نہ چلا تو شام کو غصہ آ گیا۔۔۔ اُس نے بوڑھے کو بُری طرح ڈانٹ دیا۔ بھولو چاچا حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔۔۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شام نے اُسے اِس طرح ڈانٹا تھا۔ اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا۔ شام کے چہرے کی کرختگی کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔ شام کے روپیوں کی تھیلی اُٹھا کر اُس کے سامنے پھینک دی اور روتا ہوا بولا۔۔۔

"اچھا۔۔۔ میری کوئی حیثیت نہیں! لے جاؤ اپنے یہ روپیے۔ بھولو چاچا بھیک نہیں مانگتا!"

شام کو اُسے روتا دیکھ کر دُکھ ہوا۔۔۔ لیکن اس کے سوا اُسے کوئی راستہ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ جس سے کہ وہ بھولو چاچا کو اپنے ساتھ جانے سے روکے۔۔۔ اُس کا دل اُسے اپنی اس حرکت پر ملامت کر رہا تھا۔ لیکن اُس نے اپنے چہرے سے اُس کا اظہار نہ ہونے دیا خاموشی سے پوٹلی اُٹھا کر جیب میں ڈالی۔ اٹیچی کیس اُٹھایا اور سٹیشن کی طرف چل دیا۔

گاڑی چھوٹنے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ اُس نے جلدی سے ٹکٹ لے کر جیب میں رکھا اور گاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔ جو اب آہستہ آہستہ پلیٹ فارم پر رینگنے لگی تھی؟ شام دوڑتا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا۔ چلتی ہوئی گاڑی میں جو ڈبہ اُس کے سامنے آیا۔ اُس نے اُسی کی کھڑکی میں اپنا اٹیچی کیس لٹکا دیا۔ اور خود بھی چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کسی نے اندر سے اُس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس پکڑ لیا۔ جب وہ ڈبہ میں داخل ہو گیا تو دیکھا سامنے بھولو چاچا بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔۔۔ اُس کی روئی روئی سوجی ہوئی آنکھوں میں ایک شریری سی چمک تیر رہی تھی۔

شام نے بھولو چاچا کو ڈبے میں بیٹھا دیکھا تو بے اختیار ہو کر اُس سے لپٹ گیا

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سب اُسے چھوڑ چکے تھے ـــــ اُس سے اُکتا چکے تھے۔
لیکن بھولو چاچا اب بھی اُس سے چمٹا ہوا تھا!

• • •

شام کو اپنا شہر چھوڑے مدّت ہو گئی تھی۔ اس عرصہ میں نہ تو اُس کے انہوں نے اُس کی تلاش کی اور نہ ہی خود اُس نے اُنھیں اپنے متعلق کچھ خبر بھیجنے کی ضرورت سمجھی۔ وہ مختلف شہروں میں مختلف لوگوں میں گھوما تھا۔ کئی جگہ کی خاک چھان چکا تھا۔ اس ساری مُدّت میں اگر کوئی اُس کے ساتھ رہا تو بھولو چاچا تھا۔ جو اُس کے ہزار منع کرنے پر بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ بھوکا رہا۔ پیاسا رہا۔ لیکن اُس نے شام کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ اُس کے ساتھ ہی ساتھ مارا مارا پھرتا رہا — مگر کبھی شکایت کا ایک لفظ تک منہ سے نہیں نکالا — اُسے اگر فکر رہتا تو صرف شام کا — رنج ہوتا تو صرف اس بات سے کہ شام اپنے کھانے پینے کا دھیان کیوں نہیں رکھتا۔ اس پردیس میں شام کیلئے بھی اُس کا وجود ایک نعمت سے کم نہ تھا — بھولو چاچا اُس کا ملازم ہی نہ تھا' بلکہ اب باپ، ماں، بھائی، بہن، سب کچھ وہی تھا۔ جب وہ زیادہ دُکھی ہوتا تو اُسی کے پاس جا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتا۔ اور وہ کسی مشفق باپ کی طرح اُس کی دلجوئی کرنے لگتا۔ شام اب شہر شہر گھومنے سے بھی اُکتا چکا تھا۔ اسی صحرا نوردی میں ہی اُس نے اپنی تعلیم بھی مکمل کر لی صرف اس لیے کہ اور نہیں تو

کتابوں ہی کی دُنیا میں اُلجھ جائے تاکہ پرانے لمحوں کو اُبھرنے کا موقع ہی نہ ملے۔

اب وہ ایک اچھی ملازمت پر تھا۔ اچھی آمدنی تھی، کار تھی، دولت تھی، عزت تھی۔ مگر چہرے کی اُداسی اُسی طرح قائم تھی۔ وہ خود اپنی سیمابی طبیعت سے اُکتا گیا تھا۔ اپنی بے ترتیب زندگی کو ترتیب دینا چاہتا تھا۔ بھولو چاچا کے لفظوں میں "ہوتے جینے" کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اِسی کوشش میں وہ زیادہ سے زیادہ وقت دفتر میں ٹھہرتا۔ وہاں سے سیدھا کلب چلا جاتا۔ رات گئے تک کلب کے ہنگاموں میں اُلجھے رہنے کی کوشش کرتا ——— لوگوں کو ہنستا دیکھتا۔ تو خود بھی قہقہے لگانے کی کوشش کرتا۔ لیکن قہقہے جیسے اُس کے حلق ہی میں اٹک کر رہ جاتے اور وہ اُداس ہو کر گھر کی جانب چل دیتا۔ جہاں دروازے پر بھولو چاچا اپنی حقاری منہ سے لگائے دھواں اُگل رہا ہوتا ——— اُس کے آتے ہی حقاری ایک طرف رکھ دیتا اور اُسے سُلانے کیلئے کمرے میں لے جاتا۔

اُسی دوران اُس کی زندگی میں وقتی طور پر کئی اجنبی آئے۔ کچھ چلے گئے۔ اور اپنی باتیں بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ کچھ چلے گئے۔ لیکن اپنا سب کچھ اُسی کے پاس چھوڑ گئے۔ اُنہی میں ایک آشا تھی۔ ابتدائی بکھرے ٹوٹے ہوئے لمحوں کی ایک حسین سی ملاقات ——— آشا ایک گوری چٹی دراز قد لڑکی تھی ——— ہنستی تو جیسے ہر طرف موسیقی بکھر جاتی۔ اُس نے شام کے قریب ہونے کی کوشش کی۔ اُس کی اُداس تنہائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

شام خود حالات سے سمجھوتہ کرنا چاہتا تھا۔ اپنی اُکھڑی ہوئی سانسوں کو ہموار کرنا چاہتا تھا۔ اپنی ویران زندگی کو سنوارنا چاہتا تھا ——— چاہتا تھا کہ کوئی اُسے سہارا دے، اُسے تھامے تاکہ وہ اپنے ڈولتے ہوئے قدموں کو سنبھال سکے۔

آشا نے اُسے سنبھالا دیا۔ حساس طبیعت کی لڑکی تھی۔ اُسے مغموم دیکھ کر اُس کی طرف کھنچی چلی آئی۔ ہر وقت اُس کے ساتھ رہتی۔ اُسے ہنسنے مسکرانے پر مجبور کرتی۔ اُس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا دھیان رکھتی۔ بات بات پر زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ لیکن شام

کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں چمک پیدا نہ ہوتی۔ اُس کے ہونٹ مسکرانے کے لئے کھلتے۔ مگر مسکرانے سے انکار کر دیتے۔ اُس کے دل میں اُٹھنے والی کسک اسی طرح قائم رہی ——
آشا بھی اُس کا ساتھ نہ دے سکی۔ اُس کی روٹھی ہوئی زندگی کو نہ منا سکی۔ اُس کی تنہائیوں کو دور نہ کر سکی۔ آخر تھک ہار کر چلی گئی۔ لیکن جاتے جاتے اپنی مترنم مسکراہٹ اور رسیلی یادیں اُس کے پاس چھوڑ گئی۔ شام جیسے انسان کیلئے ایک بہت بڑا سہارا تھا۔ وہ سہارا آخری دم تک قائم رہا۔ لیکن آشا چلی گئی ——

بے چاری نے اُس کے بے جان جسم میں روح پھونکنے کیلئے کیا کچھ نہیں کیا؟ ——
اُسے اپنے آپ پر غصہ آنے لگتا —— اُس نے خواہ مخواہ اپنی متعدی قسم کی مایوسی سے اُس کو بھی دُکھی کر دیا —— لیکن وہ کیا کرتا؟ اس میں اُس کا کیا قصور تھا۔ اُس نے جان بوجھ کر تو آشا کو دُکھ نہیں دیا؟؟ ——

پھر تارا آئی!

چند لمحے ساتھ رہی —— چلی گئی —— رینو نے اُس کے دل میں جھانکا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ سنتوش نے بھی اُس کی ویران زندگی میں بہار لانے کی کوشش کی۔

سنتوش ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ خوبصورت تھی اور خوبصورت زندگی گزارنے کی متمنی تھی۔ وہ اپنے لئے جس قسم کا لڑکا چاہتی تھی شام اُس سے کہیں بہتر تھا لیکن اُس کی خاموش مُرجھائی ہوئی طبیعت سنتوش جیسی چنچل لڑکی کی برداشت سے باہر تھی۔ اگر وہ ذرا مسکرا بھی دیا کرتا تو اُس میں کیا کمی تھی؟ سنتوش اس عجیب قسم کے آدمی سے جلد ہی اُکتا گئی۔ جلدی بھاگ گئی۔ آشا کے جانے پر شام کو دُکھ ہوا تھا سنتوش کے جانے پر اُسے مسرت ہوئی۔ آشا جہاں ماضی کی یاد دلاتی تھی وہاں سنتوش اُسے حال کی منتشر کہانیوں سے اُلجھاتی تھی اور شام حال میں رہتے ہوئے بھی ماضی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا تھا —— !

شام کو ہر چیز میسر تھی ۔ شاندار بنگلہ تھا ۔ خوبصورت کار تھی ۔ اور معقول سے بھی کچھ زیادہ ہی آمدنی ۔ اور یہ ایسی چیزیں تھیں جن پر نہ جانے کتنی تتلیاں پر تولتی تھیں ۔ لیکن شام ایک ایسا پھول تھا جس میں اب نہ خوشبو رہ گئی تھی اور نہ ہی رس !

وہ ایک بے جان جسم تھا جو بالکل سرد ہو چکا تھا ۔ اُس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی تھی ۔ زندگی کا احساس ہی مٹ چکا تھا ۔ اور اگر کہیں اُس میں زندگی کے آثار ملتے تھے تو صرف دل کے اُس نہاں خانہ میں جہاں بیلا کی تصویر سجی ہوئی تھی ۔ بیلا جیسے اُس کی روح پر چھا چکی تھی ۔

پھر ایک دن ایک عجیب سا ٹکراؤ ہوا ۔ وہ ٹکراؤ آشا کی مترنم مسکراہٹ اور رسیلی باتیں بھی لایا اور سنتوش کی چنچلتا بھی ۔ ماضی کی یادیں بھی ساتھ لایا ۔ اور حال کی تنہائیاں بھی آشا اور تارا سے ملاقات شعوری تھی ۔ لیکن پُشپ سے ملاقات غیر شعوری ۔

وہ بڑے ڈرامائی انداز میں اُس سے ملی تھی ۔ وہ اپنی کار میں سوار دفتر سے لوٹ رہا تھا ۔ نظریں سڑک پر جمی ہوئی تھیں اور ذہن نہ جانے کہاں تھا — ؛ وہ آج بہت دیر تک دفتر میں بیٹھا کاغذات کو اُلٹتا پلٹتا رہا تھا ۔ اور اس وقت اُس کا دماغ بالکل شل ہو چکا تھا ۔ وہ اسی حالت میں بے خیالی سے کار ڈرائیو کرتا چلا جا رہا تھا ۔ کہ راستہ میں بس اسٹینڈ پر ایک سایہ سا نظر پڑا ۔ نہ جانے کیسے اُس کا پاؤں اپنے آپ بریک کی طرف کھسک گیا ؛ نہ جانے کیوں اُس کی کار بس اسٹینڈ کے عین پاس جا کر رُک گئی ۔ اور اُس نے کار کا دروازہ کھول کر لڑکی کی طرف دیکھا ۔ بھرے بھرے جسم کی ایک شوخ الھڑ سی لڑکی تھی ۔ شام کو اُس کے چہرے پر وہی نقوش نظر آئے جن میں بیلا کی جھلک تھی ۔ اُس نے جلدی سے سوال کیا ۔

”کہاں جایئے گا — ؟“

”ماڈل ٹاؤن — !“ لڑکی نے لاپروائی سے جواب دیا ۔

"مجھے بھی اُسی طرف جانا ہے۔ اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں آپ کو پہنچا دوں۔ بس تو نہ جانے کب آئے۔"

لڑکی ایک لمحہ کیلئے جھجکی پھر خاموشی سے کار میں بیٹھ گئی۔ کار پھر سڑک پر دوڑنے لگی لڑکی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر بولی۔

"ڈیڑھ گھنٹے سے بس کا انتظار کر رہی تھی۔ اگر آپ نہ آتے تو نہ جانے اور کتنی دیر وہیں کھڑا رہنا پڑتا۔"

شام نے ان سُنی کرتے ہوئے اپنی کہی۔

"راستہ بتاتی جائیے۔ آپ کو آپ کی منزل پر اُتار دوں گا۔۔۔!"

لڑکی نے بھرپور نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے لباس کی طرف دیکھا۔ شام قطعی سنجیدہ تھا۔

"آپ نے کہاں جانا ہے؟"

شام کے چہرے پر ایک ہلکا سا رنگ آکر گزر گیا۔ اُس کی منزل کہاں تھی؟۔۔۔ لیکن لڑکی اس چھوٹی سی تبدیلی کو محسوس نہ کرسکی۔ شام نے نظریں سڑک پر ہی جمائے ہوئے جواب دیا۔۔۔

"منزل کا تو تعین نہیں کرسکا ابھی تک۔ لیکن رات بسر کرنے کیلئے آپ ہی کے علاقہ میں ایک مکان لے رکھا ہے۔۔۔"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کا مکان آپہنچا تھا۔۔۔ شام نے گاڑی روک دی۔ اور وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ اُسے اس عجیب وغریب شخص سے دلچسپی سی ہونے لگی تھی۔ وہ سارا راستہ اس اُداس اُداس آنکھوں والے خوش لباس نوجوان کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

کار سے نکل کر اُس نے اپنے سر کو جھٹکا۔ اور بولی۔

"لفٹ کے لئے شکریہ۔ جب کبھی منزل کا تعین کرنے کی ضرورت ہو، مجھے بُلا لینا۔ یہیں رہتی ہوں۔"

وہ گیٹ میں داخل ہو گئی۔ شام کچھ لمحے وہیں کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ پھر آگے چل دیا۔

پُشپ سے یہ اُس کی پہلی ملاقات تھی۔ بالکل سرسری، بے ارادہ — اچانک! — لیکن یہ بے ارادہ ملاقات آہستہ آہستہ لگاؤ میں تبدیل ہوتی گئی۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ شام کو اُس میں اپنی بیلا کے خدوخال اُبھرتے دکھائی دیتے۔ اُس کے ہونٹوں پر آشا کی مسکراہٹ دکھائی دیتی۔ اُس کی باتوں میں سنتوش کی آواز گھُلی ہوئی معلوم پڑتی۔ اُس کے سہارے اپنی پراگندہ زندگی سنورتی دکھائی دی۔ وہ خود بھی اب اپنی اُلجھی ہوئی ڈور کو سلجھانا چاہتا تھا۔ پُشپ اس کیلئے بہترین معاون ثابت ہوئی۔ منزل کے نشان واضح ہونے لگے۔

شام نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ پُشپ کے معاملے میں بڑی احتیاط سے کام لے گا۔ ایسا موقعہ ہی نہیں آنے دے گا۔ کہ پُشپ بھی اُس سے مایوس ہو کر چلی جائے۔ آشا کی طرح وہ بھی تنگ آ کر اُس سے دور ہو جائے، سنتوش کی طرح اُس سے اُکتا جائے — ...... وہ ہر ممکن کوشش کرتا کہ پُشپ کی ہنسی میں شامل ہو۔ اُسے کسی قسم کی شکایت نہ ہونے دے۔ پُشپ کی وجہ سے وہ اب اپنے متعلق بھی کافی محتاط ہو گیا تھا۔ بڑے سلیقے سے لباس پہنتا داڑھی بناتا اور بڑے رکھ رکھاؤ سے رہتا۔

پُشپ بھی ایک متمول گھرانے کی خوش پوش حسین لڑکی تھی۔ اُس کی موٹی موٹی سیاہ غلافی آنکھیں، اُس کے باریک سے مسکراتے ہوئے ہونٹ مل کر ایک ایسا سحر کر دیتے تھے

جس سے نکلنا شام جیسے انسان کیلئے بڑا مشکل تھا۔ جب وہ بات کرتی تو جیسے موسیقی کی مدھم سریلی لے چھیڑ دیتی ـــ مسکراتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے نغمہ و نور کی بارش ہو رہی ہو۔ اُس کے گورے گورے رخساروں پر شفق پھولنے لگتی۔ اور شام کو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی نے قوسِ قزح میں موسیقی گھول کر ساری فضاؤں میں تان دی ہو۔

شام میں اس نئی تبدیلی کی سب سے زیادہ خوشی بھولو چاچا کو ہوئی تھی۔ وہ اُسے مسکراتا ہوا دیکھ کر کھل سا اُٹھتا۔ حقاری کے بڑے بڑے کش لگانے لگتا اور ناک مُنہ سے دھوئیں کے بادل نکالتا ہوا سر ہلا کر کہتا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ ہونے جیسی والی باتیں کرو۔ اب آئے ہو راہ پرنا ـــ"

پھر تھوڑی دیر کے بعد کہتا:

"میری مانو تو اب گھر بسالو۔ میں بوڑھا آدمی کب تک تمھاری دیکھ بھال کر سکوں گا۔"

شام خاموش کھڑا اُس کی باتیں سُنتا رہتا۔ اور وہ تھوڑی دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد پھر اپنی بات دہراتا۔

"بہو گھر میں آئے گی تو مجھے بھی سُکھ کا سانس ملے گا۔ آرام سے بے فکر ہو کر کونے میں بیٹھا حقاری پیا کروں گا۔"

اور شام بڑی سنجیدگی سے پُشپ کے بارے میں سوچنے لگتا۔

پُشپ اُس کی ویران آنکھوں کی افسردگی کو دور کرنے کی بے حد کوشش کرتی۔ وہ خود کوشش کرتا۔ کہ کم از کم پُشپ کی موجودگی میں ہی اُس کے چہرے پر ہمیشہ طاری رہنے والی یاسیت چند لمحوں کیلئے غائب ہو جایا کرے۔ لیکن وہ کوشش کے باوجود ایسا نہ کر سکتا تھا۔ اُسکی تمامتر احتیاط کے باوجود۔ کبھی کبھی اُس کے چہرے سے دل کی حالت کھُل ہی جاتی۔ بیلا کی یاد ایک کانٹے کی طرح اُس کے سینہ میں چُبھ کر رہ گئی تھی۔ جس کا کوئی سرا باہر نہ تھا کہ اس کانٹے کو نکال کر پھینک دیتا ـــ اور یہ کانٹا رہ رہ کر کسک پیدا کرتا۔

وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا۔ نئے سرے سے قسمیں کھاتا۔ لیکن یہ اُس کے بس میں نہیں

تھا ــــــ

وہ اسی تذبذب میں تھا کہ یوگ کا خط ملا۔

"مدتوں سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ مگر تم ایسے گئے کہ پتہ

بھی نہ لگنے دیا۔ بڑی دقتوں سے تمہارا پتہ ملا ہے۔ ہم لوگ آج کل تمہارے

شہر سے کچھ ہی فاصلہ پر ہیں۔ چار یا پانچ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں کی دوری

پر ــــــ میں یہاں پر ریلوے میں کلرک ہوں۔ بیلا بھی یہیں ہے۔ تمہارے

جانے کے بعد کی بات ہے۔ اوشا کی شادی ریلوے کے ایک انجینیر سے

ہو گئی تھی۔ اُنھیں کی وساطت سے یہ کلرکی ملی ہے۔ اُنہی کے ساتھ

ہم لوگ رہتے ہیں۔ پاپا بھی یہیں ہیں!

تم جس حالت میں بھی ہو آ کر مل جاؤ ــــــ

یوگ"

یوگ کا خط کیا ملا، پُرانے زخم پھر تازہ ہو گئے۔ برسوں کی دبی ہوئی سلگتی ہوئی آگ

ذرا سی ہوا لگتے ہی پھر بھڑک اُٹھی۔ جس کسک، جس درد، جس چبھن سے چھٹکارا حاصل

کرنے کیلئے اپنا شہر چھوڑا تھا۔ اپنے لوگ چھوڑے تھے۔ وہ پھر اُبھر آئی تھی ــــــ

پہلے سے زیادہ شدید ہو گئی تھی۔ جو رشتے وہ اپنی دانست میں توڑ کر بھاگا تھا، وہ اُسی

طرح قائم تھے۔

کچھ بھی نہیں چھوٹا تھا۔ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ دل کی گرہیں اپنے ہاتھوں سے ہی

لگائی جاتی ہیں۔ لیکن اُنھیں کھول لینا اپنے ہاتھوں کے بس کی بات نہیں۔ رشتے بن جاتے

ہیں۔ اُنھیں توڑنا آدمی کے بس میں نہیں ہوتا۔ وہ اور پیچیدہ اور کٹھن ہوتے جاتے ہیں!

شام نے خط پڑھ کر میز پر رکھ دیا، اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا ــــــ جیسے

زندگی کی آخری پونجی بھی ہار گیا ہو۔ یوگ کا خط ایک سانحہ سے کم نہ تھا۔

بھولو چاچا نے شام کا رنگ اس طرح اُڑتے ہوئے دیکھا تو اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ خط اُسی نے لاکر شام کو دیا تھا۔ اور جب سے اُس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ پہلے ہی حیران ہو رہا تھا کہ یہاں اس پردیس میں شام کو خط لکھنے والا کون ہو سکتا ہے؟ بڑے صاحب یعنی شام کے والد کا خط بھی نہیں تھا۔ وہ اُن کی تحریر خوب پہچانتا تھا۔ پھر اُنہیں کیسے پتہ چل سکتا تھا کہ اُن کا بیٹا یہاں رہ رہا ہے۔ شام نے تو گھر سے نکلنے کے بعد اُنھیں تین پیسے کا کارڈ تک نہیں لکھا تھا۔ اور کسی کے خط لکھنے کا مطلب ہی اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور شام بابو کا رنگ خط کو پڑھتے ہی کیسا چٹا پھٹک ہو گیا تھا۔ جیسے پرماتما نہ کرے کسی لاش کا چہرہ ہو۔ بوڑھا بھولو اپنے آپ ہی کو گنہگار سمجھ رہا تھا۔ اُس نے کیوں جانے بوجھے بغیر ہی خط اُسے دے دیا۔ جانتا تو تھا ہی کہ شام کا دل کتنا کمزور ہے! ذرا سی بات کا بھی بڑا اثر لیتا ہے! کیوں نہ اُسے خط دینے سے پہلے اُس نے خط کسی سے پڑھوا لیا! اب واقعی اُس کی عقل ماری گئی ہے!

آخر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کس کا خط ہے؟"

شام نے اُسی طرح سر کو تھامے ہوئے ڈوبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"یوگ کا! —" اور پھر خاموش ہو گیا۔

بوڑھے بھولو چاچا کو یک گونہ تسلی ہوئی کہ کوئی بُری خبر نہیں تھی۔ لیکن پھر فوراً ہی اُسے اپنے خیالوں میں بنایا ہوا شیش محل گرتا ہوا محسوس ہوا۔ اُسے شام کی غمگینی کی وجہ تو معلوم ہو گئی۔ لیکن ساتھ ہی اُس کے دماغ میں بنی ہوئی شام کی گرہستی پھر مٹی میں ملتی ہوئی دکھائی دینے لگی —!!

●●●

جب سے یوگ کا خط ملا تھا، شام کی حالت کچھ عجیب سی ہو گئی تھی۔

کچھ ہی دیر پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ جلد سے جلد پُشپ کو دُلہن بنا کر اس گھر میں لے آئے گا۔ اپنی زندگی کی موجودہ روش کو یکسر بدل کر رکھ دے گا۔ اُسے رہ رہ کر اُن لڑکیوں کا خیال آتا جو اُس کی افسردگی دور کرنے، اُس کی ساتھی بننے کے لئے دل و جان سے کوشاں رہی تھی۔ پُشپ کا خیال آتا جو بڑی حد تک اُسے سنبھال چکی تھی۔ لیکن یوگ کا خط ملتے ہی سب کیا دھرا خاک میں مل گیا تھا۔

آشا ۔۔۔، رینو.....تارا،.....سنتوش،......پُشپ! ۔۔۔ جیسے یہ سب تصویریں ایک دم ذہن سے اُتر گئیں...... اب صرف ایک ہی تصویر، ۔۔۔ ایک ہی نقش اُس کی نظروں کے سامنے گھوم رہا تھا ۔۔۔

سیلا! ۔۔۔

شام کو ایک خیال آیا ۔۔۔ اب کیا کرے دل گا جا کر؟۔ کیا نائن بیتی ہوئی کہانیوں کو تازہ کرنے کا؟؟ ۔۔۔ لیکن یہ دماغ کی سوچیں تھیں ۔۔۔ دل نے کہا۔ "کیا حرج ہے!

ایک بار جاکر دیکھ تو آؤ ــ! مل تو آؤ ــ! آخری تمھاری محبت ہے! ــ تمھاری زندگی ہے ــ!

اور وہ اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا۔ جو کپڑے پہنے ہوئے تھا، اُنھیں میں اسٹیشن کی جانب چل دیا۔ بھولو چاچا نے روکنا چاہا ــ مگر ہمت نہ پڑی۔ شام گاڑی میں سوار ہو کر اُس اسٹیشن پر اُترا۔ معلوم ہوا کہ انجنیر صاحب اپنے عملہ سمیت آج کل کیمپ ہی میں رہتے ہیں۔ اور اُن کا کیمپ اسٹیشن سے بارہ تیرہ میل دور صحرا میں عین اُسی جگہ پر ہے۔ جہاں نئی ریلوے لائن بچھائی جا رہی ہے۔

گرمیوں کی جھلستی ہوئی دوپہر ــ اور وہاں تک جانے کا کوئی ذریعہ نہیں ــ ٹرالی جا چکی تھی اور کسی دوسری سواری کے ملنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا ــ کوئی بھی اس شکل دوپہر میں تیرہ میل کا سفر کرنے پر تیار نہ ہوتا ــ

جون کی جلتی ہوئی دھوپ اور تپتی ہوئی ریت کا ایک سیلاب سا آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا ــ حدِ نظر تک چٹیل ریتیلا میدان تھا۔ جس پر منعکس ہوتی ہوئی سورج کی تیز شعائیں عجیب و غریب لہریں سی پیدا کر رہی تھیں ــ وہ پیدل ہی انجنیر صاحب کے کیمپ کی طرف چل دیا۔

راستے میں کئی بار دماغ نے ملامت کی ــ یہ کیا حماقت ہے ــ! اتنی دور تک اس گرمی میں پیدل مر رہے ہو ــ! کیوں آئے ہو؟ واپس چلے جاؤ! ــ لوٹ جاؤ!! ــ کس کیلئے جا رہے ہو؟ کس سے ملنا چاہتے ہو؟ کسے دیکھنے جا رہے ہو؟ جو چیز اپنی نہیں ہوتی، ــ اپنی نہیں ہو سکتی، اُسے نظر بھر کر دیکھنا بھی پاپ ہے۔ گناہ ہے!!

لیکن ایک انجانی قوت خود بخود قدموں کو آگے کی طرف گھسیٹ رہی تھی ــ وہ چلا جا رہا تھا.... سورج نے بھی آخر تھک ہار کر اپنی شدت کو کم کر دیا تھا۔ مگر فضا میں ابھی تک وہی آگ بکھری پڑی تھی۔ اور سورج جیسے خود اپنی ہی برسائی ہوئی آگ سے گھبرا کر

کہیں بھاگ جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ شام پانچ چھ گھنٹے مسلسل چلنے کے بعد انجنیر صاحب کے ڈیرہ پر پہنچا تو اُس کا سارا بدن پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا۔ راہ کی گرد اور پسینہ نے مل کر اُس کے جسم اور کپڑوں پر گہرا پلستر کر دیا تھا۔ بارہ تیرہ میل کے اس سفر نے اُس کے اعضا کو شل کر دیا تھا۔ گلا سوکھ رہا تھا ــــ آنکھیں جیسے نکل کر باہر نکل آنا چاہتی تھیں۔

شام نے اپنی اُبلتی ہوئی سی نظریں اُٹھا کر لکڑی کے شہتیروں کے سہارے کھڑے ہوئے مکان کے دروازہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں جیسے ایک ہی نقطہ پر جم کر رہ گئیں ــــ جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہو ــــ کیا یہ اتنی سچ تھا؟ ــــ حقیقت تھی؟؟ ــــ اُسے کوئی دھوکہ تو نہیں ہوا؟ ــــ ..... یہ وہ نہیں ہو سکتی! ــــ اُس نے اپنی آنکھیں ملیں ــــ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا.......

جسم بیلا کا تھا..... خدوخال بیلا کے تھے ..... لیکن دروازہ کے ساتھ لگی اُس کی طرف دیکھنے والی لڑکی بیلا نہیں ہو سکتی! ..... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا! پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار کی بیٹی بیلا میں اور اس لڑکی میں زمین و آسمان کا فرق تھا ــــ! کہاں وہ ریشم و اطلس میں لپٹی ہوئی سنگ مرمر کی ترشی ہوئی سڈول مورت ..... جس کی آنکھیں قندیل کی طرح روشن تھیں۔ جس کے رخساروں پر شفق کھیلتی تھی۔ ..... جس کی ہر حرکت کے ساتھ بہاریں رقص کرتی تھیں ــــ اور کہاں یہ بجھی بجھی سی آنکھوں والی خزاں رسیدہ لڑکی ــــ زرد چہرہ ــــ جواب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئی تھی۔ ایک میلا سا کرتہ اور مسلی ہوئی سی شلوار پہنے ..... اُس کے ذہن میں برسوں پہلے کی بیلا ریت کے گھروندوں کے پاس کھڑی بچپن کی بیلا کا عکس اُبھر آیا ــــ

"بیلا ــــ !" اُس نے اُسے جھجکتے ہوئے سوالیہ سے انداز میں مخاطب کیا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو! ــــ وہ چاہتا تھا کہ یہ سوکھی سمٹی، زرد رو لڑکی انکار کر دے کہے کہ میں بیلا نہیں ہوں۔ وہ اپنی خیالی تصویر کو، اس مسخ شدہ لیکن حقیقت کے روپ

میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ مگر اُس کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی، دوسرے ہی لمحہ اُس لڑکی نے اپنی نظریں شام کے چہرے پر گاڑ دیں۔ اُس کی اُداس بجھی بجھی سی آنکھوں میں ایک تنفر آمیز چمک آ گئی۔ شام اس نفرت کو پہچانتا تھا، اِن آنکھوں کو پہچانتا تھا ــــ

"شام!" بیلا ہی تھی۔

"ہاں! ــ" شام نے جواب دیا۔ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کیوں چلا آیا۔

"کیسے آئے؟" بیلا نے اُسے اپنی سوچوں سے بیدار کر دیا۔

"سوچا، مل آؤں!"

"کہاں رہے اتنے دن؟"

"بس آوارہ گردی!"

"کیوں؟ ــ"

"کسی اپنے کی تلاش تھی!"

"بِلا ــ؟"

"جب اپنے ہی اپنے نہیں رہے، تو بیگانوں میں کہاں ملیں گے!"

"یہاں کا پتہ کیسے لگا؟" بیلا ٹال گئی!

"یوگ کا خط ملا تھا۔ اُس نے لکھا تم یہاں ہو ــــــ اوشا کے پاس۔"

"پیدل آئے ہو؟"

"ہاں! ــ"

"اِس گرمی میں؟ ٹرالی سے کیوں نہ چلے آئے؟"

"ٹرالی جا چکی تھی۔ پھر میں اب عادی بھی ہو گیا ہوں۔ گرمی سردی کا احساس اب باقی ہی نہیں رہا ــ"

شام کمرے میں چلا آیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں ایک طرف دو چھوٹے چھوٹے پرانے

ٹرنک پڑے تھے۔ دو تین ہلکی پھلکی بانس کی چارپائیاں تھیں۔ ایک کونے میں میلے کچیلے کپڑے الگنیوں پر ٹنگے تھے ــــ اور دوسرے کونے میں ایک کھاٹ بچھی تھی جس پر بستروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ بستروں کے اس ڈھیر سے ٹیک لگائے ایک مدقوق سی بزرگ صورت بیٹھی تھی ــــ ان کے داخل ہونے پر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی ــــ شام نے غور سے دیکھا تصوّر ہی تصوّر میں ہڈیوں کے اس ڈھانچہ میں رنگ بھرا۔ جانا پہچانا سا چہرہ تھا۔ جانے پہچانے سے نقوش تھے۔ لیکن وقت نے جیسے اُن پر ایک نہ مٹنے والی تحریر چھوڑ دی تھی۔ سر کے بال روئی کی طرح سفید ہو چکے تھے۔

شام نے گھور کر دیکھا ــــ بیلا کا باپ ہی تھا۔ کمرے میں کسی دوسرے کی موجودگی سے بے خبر ــــ سامنے دیوار پر نظریں جمائے خاموش پڑا تھا۔ بستروں کے بے جان ڈھیر ہی کا ایک حصّہ نظر آتا تھا ــــ شام بوکھلا سا گیا ــــ پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار کا یہ روپ اُس کے لئے بالکل اجنبی تھا ــــ اُسے ایک دھچکا سا لگا ــــ وہ اس ہنستے کھیلتے دولتمند گھرانے کو اس طرح اُجڑا ہوا بھی دیکھے گا! اُس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ بیلا اور اُسکے باپ کو اس حالت میں دیکھ کر اُسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔ وہ خود کو گنہگار محسوس کرنے لگا۔ جیسے اِس عظیم تباہی کا باعث وہی تھا۔ یہ انقلاب خود اُس کا ہی لایا ہوا تھا۔ اُس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ سادہ سے میلے کچیلے لباس میں لپٹے ہوئے اس شخص کی طرف نظریں اُٹھا کر بھی دیکھ لے۔ بیلا اس حالت میں تھی! ــــ اُس کا باپ جو موٹر کے نیچے پاؤں نہ رکھتا تھا۔ اس طرح ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر پڑا تھا۔ وہ اِن دونوں سے نظریں چھپانے لگا۔ اُن سے کوئی بات کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ آخر ڈرتے ڈرتے جھجکتے جھجکتے بولا۔

"بیلا ــــ! یہ سب ...... میرا مطلب ہے یہ ......!"

"بیلا نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ سٹپٹا گیا۔ جلدی سے کہنے لگا ــــ

"بیلا۔ سب ٹھیک ہے۔ لیکن ...." وہ فقرہ مکمل نہ کر سکا۔

"لیکن ؟ ـــ"

"میرا مطلب ہے ......"

وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ بیلا خاموش رہی۔

شام اس ماحول سے گھبرا اُٹھا۔ گھُٹن سی محسوس کرنے لگا۔ یہ چھوٹا سا لکڑی کا ڈربہ .....، اُس کا ٹوٹا پھوٹا سامان جیسے اُس کے جسم میں سوئیاں چبھونے لگا تھا۔ کچوکے دے رہا تھا۔ بیلا کی جھکی ہوئی نگاہیں جیسے اُس کے سارے بدن پر شعلوں کی بارش کر رہی تھیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس برستی ہوئی آگ میں نہ بیٹھ سکا۔ جلدی سے باہر چلا آیا۔ اتنی دیر میں اوشا کو بھی کسی نووارد مہمان کا پتہ چل چکا تھا۔ اور وہ بھی جلدی سے گھر کا کام نپٹا کر باہر نکل آئی تھی۔ شام کو بیلا کے کھوکھے سے نکلتا ہوا دیکھا تو لپک کر اُس کے پاس آگئی اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی؛ دیر کے بعد شام کو دیکھا تھا۔ بہت سی باتیں تھیں، ـــ اپنی باتیں .... اپنی شادی شدہ زندگی کی باتیں۔ شوہر کے تذکرے ..... جو شوہر کم اور انجنیئر زیادہ تھا۔ جو گھر میں آکر بھی ریلوے لائنوں کا ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے میں لگا رہتا تھا۔ اُن کے زاویے درست کرتا رہتا تھا ـــ ... یا کھانا کھا کر سو جاتا تھا۔ اُوشا اُس کی باتیں بڑے مزے سے کر رہی تھی۔

سورج غروب ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ دھندلکے آہستہ آہستہ گہرے ہوتے جا رہے تھے ـــ ریلوے لائن کے پاس ہی، اُن کے کھوکھوں کے پیچھے آموں کا باغ تھا جس میں سے چھن چھن کر آنے والی ہوا دن بھر کی گرمی کو دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دن جتنا گرم تھا، شام اُتنی ہی خوشگوار اور فرحت بخش۔

شام کچھ دیر تک مکان کے باہر پڑے ہوئے لکڑی کے شہتیر پر بیٹھا ہوا ماضی اور حال کے تارنے بانے جوڑتا رہا۔ اُس کے پاس ہی اوشا کھڑی ہو کر اُس سے

نہ جانے کیا کیا کہتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد انجینیر صاحب بھی آ گئے۔ یوگ اُن کے ساتھ ہی تھا۔ اوشا نے دونوں کو آتے دیکھا تو اپنی بات ادھوری چھوڑ کر بولی۔

" لو وہ بھی آ گئے ——"

شام ماضی اور حال کے جال سے ایک دم باہر نکلا اور اُس طرف دیکھنے لگا۔ انجینیر صاحب آگے آگے چلے آ رہے تھے۔ کاغذوں کا ایک پلندہ اُٹھائے اُن سے دو تین قدم پیچھے یوگ تھا۔ دن بھر کی تکان اور گرمی کے باوجود تر و تازہ دکھائی دیتا تھا۔ یہ محنت و مشقت، یہ دوڑ دھوپ جیسے اُسے راس آ گئی تھی —— اُس کے چہرے پر ایسی بشاشت نظر آتی تھی جیسے وہ اپنے اصلی ماحول میں آ گیا ہو —— ' اونچی حویلی، موٹروں اور ٹھیکیداریوں کی تڑک بھڑک ہی جیسے وہ گھُٹ کر رہ گیا تھا۔ یہ جیسے اُس سے دق کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ شاید اسی دن کا منتظر تھا —— اُس پُرانے ماحول کو چھوڑتے ہی جیسے اُس کے اُداس چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ شام کو دیکھتے ہی اُس سے لپٹ گیا۔

" میں جانتا تھا تم ضرور آؤ گے —— ! ان سے ملو۔ ہمارے بہنوئی ...."

اور شام نے اوشا کے انجینیر صاحب سے مصافحہ کیا۔ سیدھے سادے گھریلو قسم کے آدمی تھے۔ اُس وقت بھی جیسے اپنی پڑیوں ہی میں اُلجھے ہوئے تھے۔ دو ایک منٹ ٹھہر کر اپنے گھر کی طرف مُڑ گئے —— اوشا بھی اُن کے ساتھ ہی چلی گئی۔

" باہر کیوں کھڑے ہو؟ اندر چلو ——" یوگ نے بات چھیڑی۔

" اندر ہی سے آیا ہوں —— وہاں کمرے میں گھُٹا گھُٹا سا محسوس کرنے لگا تھا —— !"

" بیلا ہی —— ؟"

" ہاں —— !"

”یوگ نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
شام نے نظریں جُھکا لیں۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

•••

اندھیرا بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔

شام اور یوگ گھر کے سامنے ہی چارپائی بچھا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بیلا بھی پاس ہی کھڑی تھی۔ دونوں کو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر اندر چلی گئی۔ یوگ نے بات چھیڑنا چاہی۔ لیکن شام نے پہلے ہی ٹوک دیا۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"کیوں؟ اچھا بھلا تو ہوں!"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن اس جگہ ..... میرا مطلب ہے ......"

"اس جگہ نوکر ہوں۔ سرکار سے ہر ماہ ایک سو بیس روپئے ملتے ہیں! — مزے میں گزر رہی ہے —" یوگ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"وہ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں ..... یعنی تمہارے پاپا ...... !"

شام کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"پاپا ٹھیکیدار تھے — یہی نا —؟"

"ہاں لیکن ......"

یوگ نے اُس کی مشکل آسان کردی۔

"لیکن ٹھیکیداری ختم ہوگئی۔"

"کیسے —؟"

"لمبی کہانی ہے۔ ایک بہت بڑا جنگل لے رہے تھے۔ محکمہ سے بات بھی ہو چکی تھی — اسّی نوّے لاکھ روپے کا جنگل تھا۔ پاپا نے کوشش کرکے بیس پچیس لاکھ میں بات ٹھہرالی — اور بات ٹھہرانے کیلئے نہ جانے کتنا روپیہ متعلقہ افسر کے گھر میں پہنچانا پڑا۔ لیکن وہ افسر ہی بدل گیا۔ نئے افسر سے بات نہ بن سکی۔ ٹھیکہ تو قائم رہا۔ مگر جنگل وہ نہیں تھا۔ جو جنگل نئے افسر نے دیا۔ اُس میں دس پندرہ لاکھ کا مال بھی نہیں تھا۔ بڑا زبردست نقصان ہوا۔ اونچی چھلانگ لگائی تھی۔ چوٹ بھی زیادہ ہی لگی — نقصان پورا کرنے کیلئے حویلی کی قربانی دی۔ مگر تم جانتے ہی ہو ہاتھی ایک بار گر کر نہیں اُٹھتا۔ پاپا نے زمین جائیداد بیچ کر اپنی مُردہ ٹھیکیداری کو آکسیجن دیئے۔ سب کچھ ختم ہوگیا۔ لیکن ٹھیکیداری قائم نہ رہ سکی۔ ......"

یوگ ایک منٹ کیلئے رُکا۔ شام نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن وہ پھر بول اُٹھا۔

"لیکن اس نقصان نے اُنھیں بے حس سا کردیا ہے ہر وقت خاموش پڑے رہتے ہیں۔ کسی سے بات نہیں کرتے۔ چُپ چاپ خلا میں گھورتے رہتے ہیں۔"

یوگ جیسے اپنی نہیں کسی دوسرے کی کہانی سُنا رہا تھا۔ جیسے اتنے بڑے انقلاب سے اُس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا — اتنا بڑا حادثہ جیسے بے معنی ہی تھا۔ شام اس المیہ کو سُنتے سُنتے رو سا اُٹھا — اُس کا گلا گھُٹنے لگا، جیسے جن آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کررہا تھا، اُس کے حلق میں اٹک گئے ہوں۔ وہ بڑی دقت سے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"مجھے افسوس ہے —!"

" افسوس مجھے بھی ہوا تھا۔ آخر اپنے باپ ہیں۔ لیکن اس حادثے سے ان میں ایک بہت بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ بڑے بے تعلق سے ہو گئے ہیں۔ کسی سے کچھ کہتے سنتے نہیں۔ بس یہی دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے، ورنہ سچ پوچھو تو میں بڑا خوش ہوں۔ بڑی مزے دار زندگی ہے۔ نہ فکر، نہ غم !!"

" لیکن بیلا ؟ ــــ"

" اُسے البتہ دُکھ ہوا ہے۔ اس قسم کی زندگی گذارنے کی عادی نہ تھی۔!

بیلا آگئی۔ بات یہیں ختم ہو گئی۔ شام سگریٹ سلگا کر دور خلاؤں میں جھانکنے لگا۔ وہاں بیٹھے ہوئے شرم سی آنے لگی تھی۔ اُس کی ریشمی قمیص، اور سفید ریشمی پتلون جیسے اُس کے جسم کو کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں۔ وہ عجیب سی وحشت محسوس کرنے لگا۔ جی چاہتا کہ اپنا لباس اُتار کر پھینک دے۔ تار تار کر دے۔ اُسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی۔ اُسے یوگ کے سامنے ایک عجیب کمتری کا احساس سا ہونے لگا۔

یوگ اُس کے سامنے بیٹھا اپنی مچی مچی سی آنکھوں سے اُسے گھور رہا تھا؛ اُس کے چہرے پر اُبھرتے مٹتے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُکتا کر بولا۔

" کیا سوچنے لگے ــ ؟

وہ اُسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ خلاؤں میں جھانکتا رہا۔ جیسے اُس نے کچھ سُنا ہی نہ ہو ــــ

" تم جذباتی ہو جاتے ہو۔ مجھے تمھارا یہ انداز اچھا نہیں لگتا......، خود تو دکھی ہو ہی۔ دوسروں کو بھی دُکھی کرتے ہو ــ"

شام کی دور وسعتوں میں کھوئی ہوئی نظریں یوگ کے چہرے پر جم گئیں اُس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"تم لوگ میرے ساتھ چل رہے ہو —"
"کہاں ؟ —"
شام نے اپنی بات جاری رکھی —
"تم یہاں سے استعفےٰ دے دو گے! ابھی! اسی وقت!! اگر ملازمت ہی کرنا ہے تو وہاں بھی مل جائے گی — اب تم یہاں نہیں رہ سکتے —"
یوگ خاموش ہو گیا۔ شام کو جانتا تھا! ۔ اور یوگ کی خاموشی نے جیسے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا! جیسے اُس کے سر سے ایک بھاری بوجھ اُتار دیا۔ دونوں اندھیرے میں میٹھی باتیں کرتے رہے بیلا جلدی سے اُٹھ کر اندر گئی۔ اور لیمپ اُٹھا لائی۔ شام نے جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالی۔ اور سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔
"لاؤ۔ میں لیمپ روشن کر دوں!"
بیلا نے جھٹ جواب دیا — "مجھے جلانا آتا ہے۔ صرف ماچس دے دو!"
شام خاموش ہو گیا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بیلا کی طرف دیکھنے لگا۔
"کیا سوچنے لگے — ؟" بیلا نے پوچھا۔
شام کے ہونٹوں پر ایک اجنبی سی مسکراہٹ اُبھری — "سوچ رہا ہوں۔ لیمپ جلاتے اگر تمھارا ہاتھ جل جائے؟"
بیلا نے گردن جھٹکی — "پھر کیا ہوگا ؟"
شام نے اُسی رو میں جواب دیا۔
"تمھیں بھی معلوم ہو جائے، جلن کیا ہوتا ہے —"
بیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ یوگ کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی بیلا نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ دونوں کے چہروں پر ڈالی۔ پھر خاموشی سے لیمپ جلانے لگی۔ شام اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ یوگ

پاس بیٹھا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کے چہروں پر بننے مٹنے والے نقوش کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خاموش آوازوں کو سُن رہا تھا۔

رات بڑی خوشگوار تھی، چاند تو نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن سارا آسمان ستاروں سے اٹا ہوا تھا۔ اِس ویرانے میں تاروں کی بجھی بجھی سی روشنی، اور رات کے بھیانک سناٹے کو چیرتی ہوئی آبی پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ، چیختی ہوئی فضا میں لہراسی جاتی عجیب کیف کا سا عالم تھا۔ شام دن بھر کی تھکن اور اس تکلیف دہ ملاقات کے اثرات کے باوجود لکڑی کے ان کھوکھوں کے پیچھے دور آم کے باغ کی اس کشش کو نہ روک سکا اُٹھ کر چل دیا۔

یوگ نے اتنی رات گئے اُسے جاتے ہوئے دیکھ کر روکا۔

"کہاں جا رہے ہو اس وقت — ؟"

"ذرا اِس سامنے والے باغ کا ایک چکر لگا آؤں —"

"یہ بھی کوئی وقت ہے ؟"

شام کے ہونٹوں پر مری مری سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ابھی گھوم کر آجاؤں گا — تم آرام کرو۔ دن بھر کے تھکے ہوئے ہو !"

"لیکن اندھیرا روشنی بھی دیکھا کرو —!"

"ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گا — ذرا کچھ دیر ان درختوں کی تاریکیوں میں بیٹھنا چاہتا ہوں —"

"عجیب آدمی ہو۔ صبح گھوم آنا —" یوگ نے مزید اصرار کیا۔

بیلا بولی۔

"اِس وقت وہاں اکیلے جانا ٹھیک نہیں !"

شام نے اپنے دل کو سہلایا۔

"جن کا دل اپنا ساتھی ہوتا ہے۔ وہ قبر میں بھی اکیلے نہیں ہوتے۔"

بیلا خاموش رہی۔ وہ سر جھکائے باغ کی جانب چل دیا۔ لوگ بھی اُس کے ساتھ ہو لیا۔

اوشا اپنی چارپائی پر بیٹھی اُسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی بیلا کو گھور رہی تھی۔ انجنیر صاحب اُکتائے اُکتائے سے بستر پر لیٹے تھے۔ شاید خیال ہی خیالوں میں کسی لائن کا ٹیڑھا پن ٹھیک کر رہے تھے'۔

•••

دوسرے دن صبح ہی دو ٹرالیاں آگئیں، ایک پر بیلا، یوگ اور شام سوار ہو گئے اور گھر کا سارا سامان دوسری ٹرالی پر رکھ دیا گیا۔ یہی کل کائنات تھی جو عالی شان حویلی کے مالکوں، اور تین تین کاروں والوں کے پاس رہ گئی تھی۔ پنڈت پیارے لال بھی اپنے سامان کے ساتھ لاد دئے گئے۔ وہ اپنی بچی کھچی پونجی کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے اب یہ بھی ان سے چھن جانے والی ہو۔!

سب کچھ ختم ہو چکا تھا، ہٹ چکا تھا، لٹ چکا تھا۔ لیکن بیلا کی آنکھوں میں شام کیلئے پائی جانے والی اجنبیت اور نفرت اُسی طرح قائم تھی۔ اپنے اِن عارضی گھروندوں کو چھوڑتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ آنسو دُکھ کے نہیں تھے، وہ اِن عارضی طور پر بنے ہوئے دڑبوں میں خوش نہیں تھی، اپنی مرضی سے نہیں رہ رہی تھی۔ کسی وقت بھی انہیں چھوڑ سکتی تھی۔ لیکن شام کے سہارے ذلت اور مفلسی سے نکلنا بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں اُس کی شکست تھی۔ اور یہ شکست اُسے گوارہ نہ تھی۔۔۔ اُس کی خودداری گوارہ نہ تھی۔!

شام نے اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ۔ مسکرا کر بولا۔

"کچے گھروندوں کو چھوڑنے کا دُکھ ہے ؟ یہ بھی تو اُن ریت کے گھروندوں ہی طرح کچے تھے ۔۔۔ !"

بیلا نے کوئی جواب نہ دیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش تیز ہو گئی۔

"ریت کی طرح کچی دیواروں کو چھوڑتے ہوئے رو رہی ہو۔ ! لیکن تم نے تو خود ہی کہا تھا ایک دن ۔' میں ان ریت کے گھروندوں میں نہیں رہتی ۔۔۔ بھول گئی ہو گی' لیکن میں آج تک نہیں بھول سکا۔۔۔ آج میں تمھیں اُن کچے گھروندوں میں نہیں' خوبصورت پکے مکان میں لے جا رہا ہوں' کہ تمھیں پختہ اور خوبصورت مکان ہی پسند ہیں ۔۔۔ میں نے کہا تھا نا' ۔۔۔ کچے گھروندے بنانے والے ہاتھ کبھی پختہ کوٹھیاں بھی بنوا سکتے ہیں ۔۔۔"

بیلا خاموش رہی۔ ٹرالی دوڑتی رہی یوگ پاس بیٹھا مسکراتا رہا۔ شام کو اچھی حالت میں دیکھ کر اُسے دلی مسرت ہو رہی تھی۔ جیسے یہ ترقی شام نے نہیں' خود اُس نے کی تھی۔ جیسے یہ خود اُس کی فتح تھی!....... اور بیلا ہونٹوں کو دانتوں میں دبائے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ان حالات سے گذری تھی جن کے تصور سے پہلے ہی وہ مرجانا پسند کرتی۔

ٹرالی رُک گئی۔ اسٹیشن آ گیا۔۔۔ ایک زندگی پیچھے رہ گئی جسے اپنانے کے لئے اُنھیں اپنا بھرا پُرا گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ زمین' جائداد چھوڑنی پڑی تھی۔ پُر آسائش زندگی مجبوراً چھوڑنی پڑی تھی۔' اور نئی زندگی' نئی کہانی کو اپنانا پڑا تھا۔۔۔ جو لق و دق صحرا' تپتی ہوئی ریت اور ریل کی پٹریوں کی کہانی تھی۔۔۔ کچے گھروندوں کی کہانی تھی۔۔۔ خشک' بے آب زندگی کی داستان تھی۔ جسے مجبوراً اپنائے ہوئے تھے۔۔۔

اب یہ داستان بھی ختم ہو گئی تھی ۔۔۔ بہت پیچھے رہ گئی تھی ۔۔۔ جسے وہ خود بخود چھوڑ آئے تھے۔ جس سے خود بھاگ آئے تھے ۔۔۔ اب ایک نئی کہانی جنم لے رہی تھی

جو شام کی خوبصورت تین منزلہ کوٹھی سے شروع ہوتی تھی۔

ریل کا سفر ختم ہو گیا تھا۔ اور اب چار آدمیوں کا یہ قافلہ شام کی کوٹھی پر پہنچ چکا تھا۔ کوٹھی میں داخل ہوتے ہی بیلا اور یوگ، دونوں کی نظریں ایک ساتھ سنگ مرمر کی تختی پر پڑیں، جو عشق پیچاں کی بیلوں میں سے جھانک رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر شام کی طرف دیکھنے لگے۔

"بیلا کنج" یوگ نے مسکراتے ہوئے سنگ مرمر کی تحریر پڑھی۔ اُس کی آنکھوں میں سے شرارت جھانک رہی تھی — شام خاموش رہا۔

شام نے جب یہ کوٹھی بنوائی تو اُسے خیال بھی نہیں تھا کہ کبھی بیلا اُسے ملے گی! زندگی کے کسی موڑ پر پھر اُس سے مڈبھیڑ ہو جائے گی۔ پھر بھی مکان بنوایا تو بیلا ہی کے نام پر۔ ساری خرید و فروخت بیلا ہی کے نام پر ہوئی۔ کار خریدی تو اُس کی رجسٹریشن بیلا ہی کے نام پر ہوئی۔ جیسے نادانستہ طور پر سب کچھ آج ہی کے دن کے لئے جمع کر رہا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بھولو چاچا کی نظریں اُن پر پڑیں۔ وہ جیسے شام کی راہ ہی دیکھ رہا تھا۔ شام کے ساتھ بیلا، یوگ اور پنڈت پیارے لال کو دیکھ کر اُسے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ لیکن اُس نے کچھ کہا نہیں۔

ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ اُس میں اُن کی اوّلین زندگی کے نقوش تھے ٹھیکیداری کے سرمایہ دارانہ ماحول کے خد و خال، تھے — بیلا کے پتا جی بھی جیسے اپنی اصلی پُرانی دُنیا میں لوٹ آئے تھے — یوگ شام ہی کے دفتر میں ملازم ہو گیا۔ پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار پھر جاگ اُٹھے تھے اور اب شام کے سہارے پھر اپنی مُردہ ٹھیکیداری میں جان ڈال رہے تھے۔

بیلا سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی۔ لیکن خاموش تھی! — شام گھر کے معاملات

میں کم ہی دخل دیتا۔ سارا انتظام بیلا کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں کی ملاقات رات کے کھانے پر ہوتی۔ لیکن دونوں کی زبانیں بند رہتیں، جیسے وہ ایک ہی دُنیا، ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دُور تھے۔

ایک دن شام نے بیلا کے سامنے کاغذوں کی ایک فائل رکھتے ہوئے کہا۔

"موٹر اور کوٹھی کی رجسٹریشن کے کاغذات ہیں سنبھال کر رکھ لو!"

"لیکن ......!" بیلا نے حیران ہو کر پوچھا ....

"مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر تم سے پھر مل سکوں گا۔ لیکن جب کوٹھی کیلئے زمین خریدی، خود بخود تمھارا نام ہونٹوں پر آگیا۔ کار خریدی، دوکاندار نے پوچھا ـــــ کس کے نام کی رسید کاٹوں؟ اپنے آپ تمھارا نام مُنہ سے نکل گیا! کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس طرح پھر تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب تم آ گئی ہو، اپنی امانت سنبھالو، لیکن اسے کسی غلط رنگ میں نہ لینا!"

بیلا کے پاپا گھور کر شام کو دیکھنے لگے۔ یوگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھولو چاچا کے چہرے پر ناگواری کی لہریں دوڑنے لگیں۔ بیلا نے نظریں جُھکا لیں۔ شام نے پنڈت پیارے لال کو مخاطب کیا۔

"آپ سے پوچھے بغیر ہی ایک ٹنڈر بھر آیا تھا ـــــ دو میل لمبی سڑک بنوانی ہے۔ ٹنڈر منظور ہو گیا ہے!"

یوگ کا باپ حیران رہ گیا ـــــ

"لیکن ٹھیکیداری کیلئے ـــــ ....."

"فی الحال یہ چیک رکھئے، ضمانت تو جمع کروا ہی چکا ہوں، جب تک دس ہزار خرچ ہوں گے اور کا بھی انتظام ہو جائے گا۔" شام نے چیک اُن کے ہاتھ میں دیا، اور آہستہ سے باہر نکل آیا۔ اُس کے پیچھے ہی بوڑھا بھولو بھی بڑبڑاتا ہوا کمرے سے

نکل گیا۔

" کتنا خوبصورت دل ہے اس کا ــــ !" پنڈت پیارے لال کی آواز فرطِ جذبات سے رُندھی ہوئی تھی۔

"غریب آدمی کا لڑکا ہے نا !" یوگ کی آواز جذبات سے خالی تھی۔

بیلا اُٹھ کر باہر نکل گئی۔ شام باہر ہری ہری گھاس پر بوجھل دل اور بوجھل قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ وہ اُس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ شام نے خلاؤں سے نظریں ہٹا کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں یاس تھی، محبت تھی، التجا تھی اور ساتھ ہی اپنی محبت کو، اپنی زندگی کو نئے خوبصورت ماحول میں دیکھ کر پیدا ہونے والی مسرت تھی۔ کوٹھی اور کار کے کاغذ بیلا کو دینے کے بعد وہ اپنے کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا جیسے اُس کے سر سے بھاری بوجھ اُتر گیا ہو! ــــ بیلا نے اُس کی طرف گھور کر دیکھا ــــ اُس کی آنکھوں میں وہی نفرت تھی، ــــ

"تم نے میرے بھائی کو اچھی ملازمت دلوائی، میرے باپ کو نیا جیون دیا ہے اس کیلئے تمہاری شکر گذار ہوں۔ لیکن ...."

" لیکن میں نے تمہارا شکریہ حاصل کرنے کیلئے تو کچھ نہیں کیا۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا!" شام نے اُس کی بات کاٹ دی۔ بیلا کو جیسے اپنی شکست کا احساس ہونے لگا۔

" میں جانتی ہوں لیکن تم بھی جان لو ــــ میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے نہیں دوں گی۔ میں آج بھی تمہارے دوست گوپال سے محبت کرتی ہوں۔ اور آج تک میں نے جو کچھ چاہا، ــ پایا! ــ اُسے بھی پاؤں گی ــ حاصل کر کے رہوں گی۔! اور اس کیلئے میں انتظار کر سکتی ہوں! آج تک کرتی آئی ہوں! کوئی چیز میرے ارادہ کو ڈگمگا نہیں سکتی۔ میری راہ میں حائل نہیں ہو سکتی ــــ !"

" بیلا پہاڑی ندی کی طرح طیش میں آئی ہوئی تھی۔ چناب کی بھیانک موجوں کی طرح جھاگ اُڑا رہی تھی۔

شام نے اُسی رو میں جواب دیا۔

" میں جانتا ہوں۔ پہلے بھی جانتا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنی خوشی کیلئے کیا تمہاری ہمدردی کیلئے نہیں۔ میں نے ایک بار پہلے بھی کہا تھا ۔۔۔ تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے، میں تمہارے لئے گوپال کو تلاش کروں گا ۔۔۔ اُسے ڈھونڈھ لاؤں گا ۔۔۔ جب تک تمہارے حوالہ نہیں کر دوں گا ۔۔۔ چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ تمہیں مسکراتے دیکھ کر ہی میں زندہ رہ سکتا ہوں۔ تم میرے پاس گوپال ہی کی امانت ہو ۔۔۔ "

شام کی آواز گلے ہی میں رُکنے لگی۔ وہ سر جھکائے اپنے کمرے میں چلا گیا بیلا نے اُسے غلط سمجھا تھا۔ وہ اُسے حاصل کرنے کیلئے اُس کے گھر والوں کی مدد نہیں کر رہا تھا۔ وہ صرف اُسے خوش دیکھنے کیلئے، اپنی زندگی کے احساس کو باقی رکھنے کیلئے اُن لوگوں کا ساتھ دے رہا تھا۔ اپنے ہی گھر کے افراد سمجھ کر اُن کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

• • •

شام پر ایک بار پھر وہی آوارگی سوار ہو گئی۔ ایک بار پھر وہ اپنے بھرے پُرے نئے گھر، نئے ماحول اور نئی زندگی کو چھوڑ کر ایک شہر سے دوسرے شہر میں گھوم رہا تھا۔ پہلے کبھی اپنی زندگی کو سنبھالا دینے کیلئے اپنا شہر، اپنی جنم بھومی چھوڑ دی تھی۔ بچپن اور لڑکپن کی تلخ، بسیری یادوں سے پیچھا چھڑانے کیلئے مارا مارا پھر اتھا۔ اپنی لُٹی ہوئی محبت سے بھاگا تھا۔ اُسے بھولنے کیلئے جگہ جگہ گھومتا پھر اتھا۔ اب بیلا کی بھاگی ہوئی محبت کو تلاش کرتے، اُسے سنبھالا دینے کیلئے شہر شہر، گلی گلی چھان رہا تھا۔ کچھ کھونے کیلئے، کچھ بھولنے کیلئے آوارگی اختیار کی تھی۔ اب پانے کیلئے ــــ، پہلے اپنا سکون ڈھونڈھ رہا تھا۔ــ اب بیلا کی محبت، بیلا کے سکون کی تلاش تھی!

بیلا سے کہے ہوئے الفاظ ہر وقت اُسکے دماغ میں ہتھوڑے لگاتے رہتے۔ "مجھ پر یقین رکھو بیلا! میں تمھارے گوپال کو ڈھونڈھ لاؤں گا ــــ! اُسے تمھارے حوالے کردوں گا......!"

اور وہ تلملا اُٹھتا ــــ تلاش اور تیز ہو جاتی۔ شہر کا ایک ایک ہوٹل، ایک ایک کلب کھنگال ڈالتا۔ گھنٹوں ان جگہوں میں بیٹھا ہر آنے جانے والے کو گھورتا ــــ کہ کہیں وہی

گوپال نہ ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ گوپال جب کبھی ملا' انہیں تاریک اُجالوں میں ملے گا۔ جہاں کہیں کبھی ہوا' اِسی قسم کی پھیکی پھیکی' بیمار روشنیوں میں' مصنوعی خوشبوؤں سے دبی ہوئی فضا ہی میں ملے گا ۔۔۔ !"

شام کو اپنی جستجو پر اعتماد تھا۔ اپنے خلوص پر بھروسہ تھا' اپنی بے لوث محبت پہ یقین تھا کہ وہ کہیں نہ کہیں گوپال کو ضرور ڈھونڈھ نکالے گا۔ اُسے اپنے ساتھ لے جا کر بیلا کو سونپ دے گا۔ اِسی بھروسے' اِسی یقین کے سہارے اُس نے کتنی ہی جگہوں کی خاک چھانی۔ کتنے ہوٹلوں کلبوں اور شراب خانوں کے چکر لگائے! کہ گوپال انہی نیم برہنہ مقاموں پر ہو سکتا تھا۔ ! لیکن گوپال جیسے کہیں چھپ کر بیٹھ گیا تھا ۔۔۔ کہیں نہ ملا ۔۔۔ !

وہ نہ جانے کون سی دُنیا میں گم ہو گیا تھا ؟

شام تھک سا گیا۔ جس اعتماد سے اُس نے بیلا کے ساتھ وعدہ کیا تھا' جس اعتماد سے وہ گوپال کو تلاش کرنے نکلا تھا۔ وہ بھروسہ' وہ یقین جیسے ڈگمگانے لگا ۔ اعتماد ٹوٹنے سا لگا۔ تھک ہار کر واپس اپنے شہر راجدھانی میں لوٹ آیا۔

ساڑھے سات بج چکے تھے ؛ اور وہ ابھی تک راجدھانی کی پُر پیچ سڑکوں پر گھوم رہا تھا ۔۔۔ اپنے گھر تک نہیں گیا تھا ۔۔۔ وہ ڈر رہا تھا ...... جھجک رہا تھا .... اگر بیلا مل گئی ؟ ...... اگر اُس نے گوپال کے متعلق پوچھا ؟؟ ...... اُس سے اپنے گوپال کو مانگا !؟ ...... وہ گوپال کو تلاش کرنے نکلا تھا اور اب ناکام ہو کر لوٹ رہا تھا۔ کئی دنوں کی دوڑ دھوپ اور ناکامی نے اُسے شل کر دیا تھا ۔۔۔ تھکے تھکے سے احساس اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں نے سامنے کی خوبصورت عمارت میں پناہ لینے پر مجبور

کردیا، وہ مضمحل ذہن کے ساتھ سوئی ہوئی رات میں جاگتی ہوئی اس عمارت میں داخل ہوگیا۔ راجدھانی کا سب سے بڑا اور بارونق کلب تھا۔ شام ہال کی پھیکی زرد دودھ سی روشنیوں میں سے گذرتا ہوا ایک خالی میز کے قریب جاکر بیٹھ گیا۔ سامنے بنی ہوئی سٹیج سے آرکسٹرا کی مدھم دھنیں اُبھر رہی تھیں۔ ہال کی فضا سگریٹ کے دھوئیں، اور مختلف قسم کی شرابوں کی بو سے بوجھل ہو رہی تھی۔ ایک عجیب پُر اسرار خاموش سا ماحول تھا۔ جس میں آرکسٹرا کی دھیمی آواز، یا کبھی کبھی کسی میز یا ریشمی پردوں کے پیچھے سے اُبھرتے والے قہقہے تھوڑا سا ارتعاش پیدا کردیتے۔ شہر کی اعلےٰ سوسائٹی کا کلب تھا۔ بڑے بڑے سرکاری افسر، سکریٹری، ڈپٹی سکریٹری اور بڑے بڑے تاجر اس کے ممبر تھے۔ بڑے بڑے سیاسی اور سماجی رہنما تھے جو دن بھر کی غیر دلچسپ اور بے کیف کاروباری مصروفیتوں سے بھاگ کر سیدھے یہیں آجاتے تھے۔ دن کی تیز روشنیاں جنکی آنکھوں کو چندھیا دیتی تھیں۔ یہ لوگ رات کے اندھیرے ہی میں پوری طرح آنکھیں کھول سکتے تھے۔ دن بھر کے ہنگاموں کے بعد یہاں آتے۔ اور کلب کی دھندلائی ہوئی روشنیوں میں سرکتے ہوئے اندھیروں میں گم ہوجاتے۔ دن بھر کی بے کیفی اور بوریئت سے چھٹکارا پانے میں مشغول ہوجاتے۔

ہال میں ہر طرف جام چھلک رہے تھے۔ دھواں اُڑ رہا تھا۔ نوٹ سرسرا رہے تھے۔ موسیقی کی آواز قدرے اونچی ہوگئی تھی۔ اور چند نوجوان خوش پوش جوڑے ایک دوسرے کی کمر میں بانہیں ڈالے آرکسٹرا کی دُھن پر ناچنے لگے تھے۔ میزوں پر تاش اور شطرنج کی چالیں ہو رہی تھیں، کچھ پی رہے تھے، پلا رہے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سرگوشیوں ہی سرگوشیوں میں نئے پیمان ہو رہے تھے۔ پرانے عہد ٹوٹ رہے تھے شراب اور سگریٹ کے دھوئیں میں تحلیل ہو ہو کر مر رہے تھے۔۔۔!

کلب کی ہر شئے متحرک تھی۔ شراب کے گلاس، بیئر کی بوتلیں، سفید اُجلی وردیوں میں

ملبوس بیرے، رنگین ساڑیاں، بے شکن اچکنیں۔ ریشمی سائے...... سب متحرک تھے۔ اِدھر سے اُدھر، ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں آجا رہے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کیلئے مچل رہے تھے۔ ایک عجیب سی افراتفری تھی! — شام اس ماحول کیلئے قطعی طور پر اجنبی نہیں تھا۔ پھر بھی اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کلب میں نہیں بیٹھا — انجانے میں لٹیروں کی کسی بستی میں آ گیا ہو — جہاں ہر شخص کچھ نہ کچھ لوٹ رہا تھا، — کچھ نہ کچھ لُٹا رہا تھا،... عجیب سی لین دین تھی...... عجیب سے لوگ تھے!!... جوئے کر ہنس رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے۔ لوٹ کر لسوڑ رہے تھے...... عجیب سی لوٹ تھی۔

شام اس لوٹ کھسوٹ سے تنگ آ گیا — یہاں گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔ اُس نے اُکتائی ہوئی نظروں سے ہال کا جائزہ لیا۔ زیادہ دیر تک اِس گھٹن میں بیٹھے رہنا شام جیسے کھلی فضاؤں میں پلے ہوئے آدمی کیلئے مشکل تھا —! وہ واپس اپنے شہر میں لوٹ آیا تھا۔ لیکن یہاں کلب میں سے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ کسی اجنبی شہر کے اجنبی لوگوں میں گھر گیا ہو! —

ہال میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے اُس کی نظر اچانک ایک میز پر آ کر رُک گئی۔ وہ ٹھٹک سا گیا۔ چار پانچ میزیں چھوڑ کر ایک مانوس سی شکل بیٹھی تھی۔ ہال کی ملگجی روشنی میں بھی جانی پہچانی سی نظر آتی تھی — جانے پہچانے سے نقوش تھے — جانے پہچانے خدوخال! — شام آہستہ سے اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھا۔ وہ دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے کسی گہری سوچ میں منہمک تھا — اُس کی آنکھیں ایک کیبن کے ریشمی پردوں کو گھور رہی تھیں۔ شام نے قریب جا کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا —

ہاتھوں پر ٹکے ہوئے چہرے کو جُنبش ہوئی۔ بوجھل پلکیں اوپر اُٹھیں، — اور دو بپھرائی ہوئی سی سُرخ آنکھیں شام کی طرف دیکھنے لگیں۔ اُن میں ایک لمحہ کے لئے ایک

چمک سی آگئی ۔۔۔

"تم ؟ ۔۔۔"

شام کی مہینوں کی تلاش کامیاب ہوگئی ۔ گوپال کو دیکھتے ہی وہ بے خود سا ہوگیا۔ بچپن کی رفاقت، معصوم جھڑپیں ۔۔۔۔۔ سب ایکبارگی نظروں کے آگے گھوم گئیں ۔ برسوں پہلے کا کھلنڈرا گوپال ذہن کے کسی گوشے سے اُبھرنے لگا ۔۔۔ وہ بھول ہی گیا کہ جس گوپال کی تلاش میں مہینوں سے سرگرداں تھا۔ جگہ جگہ کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ وہ اُس کے سامنے بیٹھا، اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا ہے ۔۔۔ اس وقت نہ بیلا تھی، نہ کچھ اور، صرف بچپن کا ساتھ، لڑکپن کی یادیں سامنے کھڑی مسکرا رہی تھیں ۔۔۔! اُس نے گوپال کو کرسی سے کھینچ لیا۔۔۔ اور بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔

"یہاں کہاں ؟" گوپال نے نشے میں ڈوبی ہوئی میٹھی میٹھی سی آواز سے اُسے جھنجھوڑا۔

"تمہیں تلاش کرتا آپہنچا ہوں !"

"اچھا ہوا۔ میں بھی تمہیں ڈھونڈھ رہا تھا۔" گوپال نے اپنے خالی گلاس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے کتنے مہینوں سے تمہیں ڈھونڈھ رہا ہوں۔ اُٹھو اب چلیں !!"

"کہاں ۔۔۔ ؟"

"پہلے یہاں سے نکلو۔۔۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں !" شام نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے بھی بہت کچھ کہنا ہے۔ لیکن ابھی کچھ دیر ٹھہرو !"

"کیوں ۔۔۔ ؟"

"رانی آرہی ہوگی !"

"رانی کون — ؟"

"ابھی آجائے گی۔ خود دیکھ لینا۔"

"رانی سے پھر مل لینا۔ اِس وقت چلو!"

"تھوڑی ٹھہر جاؤ۔ وہ آہی رہی ہوگی — روز آتی ہے مجھے لینے کے لئے آج میں نہ ملا۔ پریشان ہو جائے گی —!"

"لیکن یہاں سے تو اُٹھو — باہر کھُلی ہوا میں انتظار کرلیں گے —!"

شام یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ گوپال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اُس کے ساتھ چل دیا — دروازہ پر پہنچ کر ایک لمحہ کیلئے رُکا — اور شام کی طرف دیکھ کر کہنے لگا —

"تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ اور رات ابھی باقی ہے۔ تھوڑا سا پٹرول لے لو۔"

شام اُس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"پٹرول، میرے دوست! پٹرول!! — سامنے کاؤنٹر سے آدھی بوتل پٹرول کی لے آؤ — اس کے بغیر زندگی کی گاڑی نہیں چل سکتی — اور رات ابھی بھیگی ہے ہمیں بڑا لمبا سفر طے کرنا ہے۔ برسوں کی مسافت ہے —" گوپال نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

شام خاموشی سے کاؤنٹر کی طرف مُڑ گیا — وھسکی کی ایک بوتل لئے لوٹا تو گوپال دروازہ کا سہارا لئے کھڑا تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک خوبصورت سی جوان لڑکی کھڑی تھی۔

"تم سے کتنی بار کہا ہے، اتنی نہ پیا کرو —" لڑکی کی آواز آئی۔

"اتنی کہاں پیتا ہوں رانی! تم تو جانتی ہو۔ صرف زندگی کی گاڑی ......

ہچ! ......"

"چلو اب بہت دیر ہو گئی ہے —" لڑکی نے گوپال کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔

"کہاں ــــ ؟" گوپال نے پوچھا۔

"گھر اور کہاں۔"

"نہیں رانی! آج میں گھر نہیں جاؤں گا ــــ یہ شام ہے نا! میرا بڑا پیارا دوست ہے۔ بچپن کا ساتھی ہے برسوں کے بعد ملا ہے۔ آج میں اس کے ساتھ جاؤں گا! تم جاؤ!"۔

رانی نے شام کی گھوم کر ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی ــــ دونوں نے ایک دوسرے کو گھور کر دیکھا۔ شام بوکھلا سا گیا۔ رانی مسکرا دی ــــ

شام بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والی اِس لڑکی کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اُس کی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں بیلا کی سسکتی انتظار کرتی ہوئی صورت نظر آرہی تھی۔ جو ابھی تک گوپال کا انتظار کر رہی تھی ــــ !.... وہ تھرّا گیا۔ ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اُس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا ــــ اور رانی سے مصافحہ کیا۔

تینوں باہر آگئے۔

اندر ہال میں وہی رونق تھی ــــ !.... وہی چہل پہل تھی ــــ لیکن باہر سنّاٹا طاری تھا۔

گوپال نے ٹیکسی رُکوائی۔ تینوں خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ٹیکسی چل دی۔ ــــ گوپال کہہ رہا تھا۔

"یہی رانی ہے! تم پوچھ رہے تھے نا!"

راستے میں رانی ایک جگہ اُتر گئی۔ اور اپنے گھر چلی گئی ــــ رانی کے اُترنے کے بعد ٹیکسی کے اندر سکوت سا چھا گیا۔ ٹیکسی ماڈل ٹاؤن والی سڑک پر بھاگنے لگی ــــ دونوں چپ تھے۔ جیسے دونوں کسی گہری سوچ میں کھو گئے ہوں۔ ماضی کی دبی ہوئی دھندلائی ہوئی یادوں پر پڑی منوں مٹی کو ہٹانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ دونوں ٹیکسی میں ایک ایک کھڑکی سنبھالے باہر اندھیری رات میں بھاگتی ہوئی سڑک پر خلاؤں میں گھور رہے تھے۔

ماڈل ٹاؤن آگیا۔

گوپال اپنی سیٹ پر بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا تھا۔ شام نے بیلا کنج کے سامنے ٹیکسی رُکوائی۔ گوپال کو سہارا دے کر اُتارا اور کوٹھی کے اندر چلا آیا۔

دروازہ کی گھنٹی بجی ـــــ

بھولو چاچا اپنی خاکی وردی میں آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ شام کو دیکھ کر ایک لمحہ کیلئے حیران سا رہ گیا۔ حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبہ میں بُت سا بن گیا۔ اتنے دنوں کے بعد شام واپس لوٹا تھا۔

بھولو چاچا بڑبڑاتا ہوا ڈرائنگ روم کھولنے چل دیا ـــــ

•••

رانی کو دیکھ کر شام چونک سا اُٹھا تھا۔ اُس کے خوبصورت معصوم چہرے پر اُسے اپنے پن کے نقوش نظر آئے تھے ۔۔۔ وہ ٹھٹک سا گیا۔

رانی ایک متوسط گھرانے کی معصوم سی لڑکی تھی۔ جسے ورثہ میں اپنی ذات کے سوائے کچھ نہیں ملا تھا ۔۔۔ باپ بچپن ہی میں مر گیا تھا؛ ایک ماں تھی اور ایک چھوٹا بھائی ۔۔۔ ماں نے جوں توں کر کے بیوگی کے چند سال کاٹے۔ بچے کھچے سرمائے اور چند گہنوں کے سہارے رانی اور اُس کے بھائی کو سنبھالے رہی ۔ لوگوں کے کپڑے سی سی کر لڑکی کو میٹرک تک تعلیم دلائی اور ٹائپ سکھلادی، رانی اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتی تھی۔ ایک فرم میں ملازم ہو گئی ۔۔۔ دو سو روپے ماہوار ملتا تھا اور اس کے سہارے تین زندگیاں موت سے لڑ رہی تھیں۔ رانی محنتی لڑکی تھی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔ کیونکہ یونیورسٹی کے سرٹیفکیٹوں کے بغیر اس دُنیا میں جدو جہد کرنا ناممکن تھا۔ اور اب اس محنت، اُن سرٹی فیکیٹوں کے سہارے ایک پرائیویٹ فرم

میں پانچ سو روپے لے رہی تھی۔

لیکن بھائی نے شاید قسم کھا رکھی تھی کہ خوشگوار زندگی بسر نہیں کرے گا۔ فاقہ کشی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ جلد ہی جی چھوڑ بیٹھا اور اس سے پہلے کہ رانی اُس کی دوا دارو کے قابل ہوتی۔ وہ دق کا شکار ہو کر چل دیا۔

ماں کیلئے اپنے اکلوتے لڑکے کی موت ایک دردناک حادثہ سے کم نہ تھی۔ ابھی شادی ہوئے پانچ سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ شوہر نے جینے مرنے کا ساتھ دینے کی قسموں کے باوجود مُنہ موڑ لیا۔ دو معصوم جانوں کا بوجھ اس اکیلی ذات پر چھوڑ کر چل دیا۔ بڑی مشکل سے تن تنہا اُس کی نشانیوں کو سنبھالے بیٹے کی آس پر بیٹھی تھی اُس کے مرتے ہی بستر پر لیٹ گئی۔ پھر نہ اُٹھی اور ایک دن رانی کو اس وسیع و عریض دُنیا میں چھوڑ کر چل دی۔

رانی اب بالکل اکیلی تھی۔ اپنا پرایا کوئی نہیں تھا۔ شروع ہی سے مصیبتیں اور دُکھ دیکھے تھے۔ ان حادثوں نے اُس کے معصوم دل کو بڑا گداز کر دیا تھا۔ دُکھوں میں پلی ہوئی رانی کسی کو بھی دُکھی نہ دیکھ سکتی تھی کہ خود ان ٹیسوں سے واقف تھی۔ اُن سے دوچار ہو چکی تھی۔

رانی خوبصورت تھی۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، کمر کے نیچے تک لٹکے ہوئے سیاہ بال، سڈول جسم اور متناسب اعضاء، سب مل کر اُسے ایک پیاری سی موہنی سی تصویر بنا دیتے تھے۔ رانی جتنی خوبصورت تھی۔ اُتنا ہی خوبصورت اُس کا دل تھا۔

جب وہ گوپال سے ملی۔ گوپال اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ لٹا چکا تھا۔۔۔۔ ساری جائیداد بیچ کر اپنی عیش کوشیوں کی نذر کر چکا تھا۔ اب نہ موٹر تھی، نہ بنگلے۔ نہ دولت تھی، اور نہ ہی وہ صحت! ۔۔۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا! ۔۔۔ رانی نے اُسے بھٹکا ہوا

دکھیا؛ اُجڑا ہوا دیکھا، اُس کا بازو تھام لیا، اپنے گھر لے گئی۔ اُسے راہ پر لانے کی کوشش کرتے لگی! ـــ لیکن وہ بہت دور جا چکا تھا۔ اب اُس کا لوٹنا مشکل تھا۔ رانی یہ اچھی طرح جان گئی، مگر خاموش رہی۔ اُس کی اپنی ضرورتیں بہت محدود تھیں۔ سارا زویہ گوپال کی شراب اور آوارگی کی نذر ہو جاتا۔

گوپال اُس کے سہارے پھر اپنی نشاط کوشیوں میں ڈوب گیا۔ ہر شام کلب جاتا، بے تحاشا پیتا ـــ گئی رات تک وہیں بیٹھا رہتا ـــ، ہر شب رانی اُسے وہاں سے لے کر جاتی ـــ کلب کے دروازہ کے باہر انتظار کرتی رہتی ـــ جب آدھی رات تک وہ کلب سے باہر نہ نکلتا تو اندر جا کر اُس کے مدہوش بے حس جسم کو سہارا دے کر گھر لے آتی۔

شام سوچ رہا تھا ـــ گوپال کتنا خوش قسمت ہے! ـــ اُسے ہر قدم پر خوبصورت سہارے مل جاتے ہیں؛ ہر لغزش پر اُسے سنبھال لیتے ہیں! ـــ اُس کی آوارگی ـــ اُس کی بلا نوشی اور تباہ حالی کے باوجود اُس سے پیار کرتے ہیں۔ اپنا سب کچھ اُس پر قربان کر دیتے ہیں!

رانی کو دیکھتے ہی شام کی نگاہوں میں بیلا کی تصویر گھوم گئی۔ جو رانی ہی کی طرح آج تک گوپال کو اپنائے ہوئے تھی۔ اُس کی یاد کو سینے سے لگائے انتظار کر رہی تھی!...... اُس نے ہمیشہ رانی جیسی لڑکیوں کو پسند کیا تھا جو اُس کی ویران اُجڑی ہوئی زندگی کو سنبھال لیں۔ اُس کے بے حس جسم میں زندگی پھونک دیں۔ مگر گوپال نے ہمیشہ اُسے شکست دی تھی ـــ ہر بار اُس کی پسند کو اپنی محبت بنا لیا تھا ـــ ہر بار جیت گیا تھا!......

شام کو گوپال پر رشک آنے لگا، ـــ رانی اور بیلا!...... بیلا اور رانی!!۔ دو جسم ایک روح......؟ ایک جسم دو روحیں؟؟ ـــ وہ حیران تھا۔ ـــ گوپال

کو کہاں سے ایسی لڑکیاں مل جاتی ہیں؟ — کیوں، صرف اُسی کو تھامنے کے لئے دوڑتی ہیں؟ — آخر کیوں؟...... کیوں؟؟...... ؟؟

لیکن اس کیوں کا جواب اُسے نہ ملا۔ اُس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا اور میز پر جھک گیا۔

• • •

گوپال صوفہ سیٹ پر بیٹھا ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کو یہ سب ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا، ــــ قیمتی صوفہ سیٹ، خوبصورت ریڈیوگرام بیش قیمت ایرانی قالین ..... یہ آرائش! ...... اُسے گمان تک نہیں تھا کہ شام اتنا اونچا اُٹھ سکتا ہے، وہ کبھی شام کی طرف دیکھتا۔ اور کبھی ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی چیزوں کی طرف ــــ وہ حیران ہو رہا تھا ــــ

"یہ تمہارا مکان نہیں ہو سکتا ــــ"

شام صرف مسکرا دیا، گوپال نے اپنی بوجھل پلکیں اُٹھا کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا ــــ دیر تک اُس کی طرف دیکھتا رہا ــــ.....

"کیا سوچنے لگے؟" ــــ شام نے پوچھا۔

گوپال جیسے نیند سے چونکا ــــ

"کچھ نہیں ــــ"

دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے ــــ درمیان میں صرف

ایک چھوٹی سی تپائی تھی جس پر شراب کی بوتل، گلاس اور برف وغیرہ رکھی تھیں ۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ؛ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے ـــ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے ۔ ایک کو تمام عمر ٹھوکریں ملی تھیں، مفلسی ملی تھی، ـــ تمام عمر ٹھکرایا گیا تھا ـــ مگر اب خود ہی سنبھل گیا تھا ۔ دولتمند تھا ۔ ہر قسم کا آرام و آسائش حاصل کر چکا تھا ۔ اپنے پاؤں پر کھڑا تھا ۔ دوسروں کو سہارا دے رہا تھا! ـــ

دوسرا تمام عمر ٹھکراتا رہا تھا ـــ سنبھلا رہا تھا ـــ ورثہ میں مُفلسی کے بجائے زمین، جائیداد، بنگلے، موٹر اور لاکھوں روپیہ نقد ملا تھا ۔ آج تک عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا تھا ـــ آج جیتتا آیا تھا ـــ ہراتا آیا تھا ـــ لیکن اب خود ہار گیا تھا ـــ سب کچھ کھو چکا تھا، لٹا چکا تھا ـــ اور اب اپنی نشاط کوشیوں کو جاری رکھنے کے لئے رانی کے سہارے کا دست نگر تھا ـــ

شام نے گلاس پیش کیا ـــ "لو ـــ ! پیو ـــ !"

گوپال نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری ۔ اور گلاس اُٹھا لیا ـــ

"تم ؟ ـــ"

"آج صرف تمہیں کو پلانا چاہتا ہوں !"

گوپال نے خاموشی سے گلاس کو منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر کے میز پہ رکھ دیا ـــ شام نے گلاس پھر بھرا ـــ

"تمھارے لئے سارا ملک چھان مارا ـــ مگر کیا معلوم تھا کہ تم یہیں راجدھانی میں ملو گے ـــ ! یہاں کب سے ہو ؟"

"تم سے ملنے کے بعد یہیں چلا آیا تھا !" گوپال نے جواب دیا ۔

"لیکن وہاں کی جائداد وغیرہ ......"

گوپال کے ہونٹوں پر ایک لٹی لٹی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے گلاس اُٹھا کر حلق میں اُنڈیلا۔

"سب بِک گئی؟"

"بیچ دی ـــ"! مختصر سا جواب ملا۔

"اِن دنوں کیا کر رہے ہو؟"

"رانی سے ملے تھے؟"

شام خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر بولا ـــ

"بیلا سے ملو گے؟"

"نہیں۔"

"وہ تم سے محبت کرتی ہے!"

گوپال خاموش رہا۔ شام نے اپنی۔

"بیلا اب تک تمھارا انتظار کر رہی ہے!"

"میں نے کبھی بھی کسی کا انتظار نہیں کیا۔۔!" گوپال نے اپنا گلاس بھرتے ہوئے کہا۔

"لیکن! ...."

گوپال نے اُسے فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی ٹوک دیا۔

"تم جانتے ہو، رانی بھی مجھ سے محبت کرتی ہے ...... مجھے اپنانا چاہتی ہے!

"تو پھر اُسی کو اپنا لو!" شام نے جواب دیا۔

"نہیں۔ رانی کو خود ایک سہارے کی ضرورت ہے اور میں اُس کا سہارا نہیں بن سکتا۔ میں محض ایک بوجھ ہوں۔"

"بیلا تمہیں سہارا دے سکتی ہے! آج بھی وہ تمھاری یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔!"

"گوپال نے نیا سگریٹ سلگایا۔ گلاس میں اور شراب اُنڈیلی۔۔۔
تم بھی تو اُس سے محبت کرتے ہو؟"
"میں جانتا ہوں۔ لیکن میں اُسے کبھی بھی نہیں اپنا سکتا!" شام کی آواز میں ٹھہراؤ سا آ گیا
ایک ایک لفظ جیسے اُس کے سینے کو چیر کر نکل رہا تھا۔۔۔۔
"میں نے اُسے قریب سے دیکھا ہے۔ وہ سوائے تمھارے اور کسی کو نہیں اپنائے گی!
جیسے بھی ہو، جس حالت میں بھی ہو وہ تمہیں قبول کرے گی۔۔۔ کہ تم اُس کی منزل ہو! اُس کی
محبت ہو!!" شام جذبات کی رو میں بہنے لگا تھا۔ گوپال شراب سے بھرے ہوئے گلاس
کو ہاتھوں میں جکڑے اُس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ شام کہہ رہا تھا۔۔۔۔
"تم اُسے مسرتیں دے سکتے ہو۔ اُس کی ادھوری زندگی کی تکمیل کر سکتے ہو۔
میں نے اُس کے کئی روپ دیکھے ہیں۔ اُسے اپنے پرانے شہر کے پنڈت پیارے لال ٹھیکیدار
کی دولت مند مغرور لڑکی کے روپ میں دیکھا ہے۔ اُس وقت بھی وہ تمھاری تھی۔ میں نے
اُسے لُٹے ہوئے غریب گھر کی، میلے کچیلے لباس میں لپٹی ہوئی، ایک کلرک کی بہن کے روپ
میں بھی دیکھا ہے، جب بھی اُس کی آنکھوں میں تمھاری ہی تصویر تھی، وہ تمھارا ہی انتظار کر رہی
تھی۔۔۔ ! اور آج بھی جب وہ پھر اپنی پرانی دُنیا میں لوٹ آئی ہے، خوبصورت ماحول میں
پہنچ چکی ہے۔ جب بھی اُس کی کھوئی کھوئی سی متلاشی آنکھیں، صرف تمہیں ڈھونڈھ رہی
ہیں۔ تمہیں تلاش کر رہی ہیں۔ تم ہی اُس کی بھٹکتی ہوئی مایوس روح کو سکون دے سکتے ہو!۔
اگر ایسا نہ ہوتا، اگر وہ تمہیں چھوڑ سکتی تو شاید مجھے تمھاری تلاش میں نہ نکلنا پڑتا۔۔۔ لیکن
وہ آج تک تمہیں نہیں بھول سکی۔ آج تک صرف تمھارا انتظار کر رہی ہے۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔"
"تم جذباتی ہو رہے ہو!" گوپال نے بھرّائی ہوئی آواز سے اُسے ٹوکا۔۔۔۔"
"اور میں ہر چیز کو اُس کے اصلی روپ میں دیکھتا ہوں۔ بیلا سے میں اب نہیں مل سکتا۔۔۔ مجھ میں اتنی ہمت
ہی نہیں رہی۔۔۔"

گوپال ایک گھونٹ بھرنے کیلئے رُکا ـــــ

خیب میں اُسے سنبھال سکتا تھا۔ اُس وقت نہیں سنبھالا۔ اب میں اس قابل ہی نہیں رہا ـــــ"

شام کہنے لگا ـــــ "میں جانتا ہوں۔ لیکن جو ڈگر تم نے اپنا رکھی ہے وہ بھی تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ تم زندہ رہنا چاہتے ہو۔ مگر موت کے انتظار میں پڑے ہو تم مرنا نہیں چاہتے۔ مگر زندگی کو پرے دھکیل رہے ہو! تم اگر چاہو تو کیا نہیں ہو سکتا؟ تم اپنی اس اُجڑی بکھری زندگی میں رنگ بھر سکتے ہو ـــــ اپنی کھوئی ہوئی زندگی کو واپس بُلا سکتے ہو ـــــ ہم دونوں ساتھ ہی پلے بڑھے ہیں۔ بچپن کے ساتھی ہیں۔ اگر میری وجہ سے تمہیں خوبصورت زندگی مل سکے تو مجھ سے زیادہ خوش کون ہوگا ـــــ؟"

گوپال نے اپنے خشک جلتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ سگریٹ کا طویل کش کھینچا "خوبصورت زندگی میں بھی چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے ذرائع ـــــ؟" وہ کہتا کہتا رُک گیا۔ شام نے اُس کی بات سمجھ لی۔ اُسے بات بھی پوری نہ کرنے دی ـــــ بولا ـــــ

"ذرائع میرے پاس ہیں۔ تم اپنا سارا قرض اُتار سکتے ہو۔ چاہو تو کسی اچھی سی ملازمت کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ پڑھے لکھے ہو، چاہو تو کوئی اپنا کاروبار بھی شروع کر سکتے ہو۔ ویسے بیلا تمہیں اس حالت میں بھی گلے سے لگا لے گی کہ تم اُس کی منزل ہو۔ اُس نے اگر زندگی میں کسی سے محبت کی ہے تو وہ تم ہو ـــــ!"

گوپال خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اُس کے چہرے کو گھورتا رہا۔ خالی گلاس اُس کی انگلیوں میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ شام نے ایک ساتھ دو سگریٹ سلگائے اور ایک گوپال کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولا ـــــ

"میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں مانگا، کچھ نہیں چاہا ـــــ بلکہ اپنی محبت بھی

تم پر قربان کر دی، اپنی مسرتوں کو اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیا کہ اسی میں تمہاری خوشی تھی۔
تمہاری بیلا کی خوشی تھی۔ لیکن آج میں تم سے اپنے بچپن کی رفاقت کے نام پر مانگتا ہوں!
تم مت بھرنے دو ۔۔۔ ! اپنے بچپن کی ان پرانی یادوں کیلئے بیلا کو اپنا لو ۔۔۔ تمہیں
پا کر وہ جی اُٹھے گی ۔۔ اُسے زندگی مل جائے گی ۔۔ اور اُس کی مسرتوں میں ہی میری دبی
ہوئی سانسیں چھپی ہوئی ہیں، اُسے تمہارے ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھا، مجھے مسرتیں مل جائینگی۔
کچھ نہیں تو ان معصوم یادوں ہی کا پاس کرو ۔ اُن الھڑ معصوم کھیلوں کا احترام کرو جو ہم
تینوں اپنے پرانے شہر کے گلی کوچوں میں کھیلتے تھے! اپنی ڈگر کو بدلو ۔۔ میں تمہیں سب
کچھ دوں گا ۔۔۔"

شام نے اُنگلیوں میں دبے ہوئے سگریٹ کا کش لیا۔ اور گلاس میں شراب
انڈیلنے لگا ۔۔ گوپال کی آنکھیں بدستور اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ بوتل تین چوتھائی
تک خالی ہو چکی تھی ۔۔ اور گوپال یخ بستہ شراب کے گلاس کو کنپٹیوں سے لگائے
حیران حیران سی نظروں سے شام کی طرف دیکھ رہا تھا ۔۔ اس قدر پینے کے بعد بھی وہ
قطعی طور پر نشہ نہیں محسوس کر رہا تھا۔ شام کی مُردہ آنکھوں میں سوئی ہوئی بیمار سی محبت
کو دیکھتے ہی اُس کا سارا نشہ اُتر جاتا ۔۔۔

شام نے اُسے اس طرح ٹکٹکی لگا کر گھورتے ہوئے دیکھا تو بولا۔

"اب سو جاؤ ۔۔۔ ! رات کافی گذر چکی ہے ۔!!"

گوپال نے کوئی جواب نہ دیا۔ جلدی سے گلاس کو خالی کیا اور خاموشی سے وہیں
صوفہ پر ہی لیٹ گیا۔ شام اُسی طرح بیٹھا سگریٹ پھونکتا رہا۔ صبح تک اسی طرح بیٹھا
رہا۔ جیسے اُسے خوف ہو کہ گوپال پھر کہیں بھاگ جائے گا ۔۔ میز پر رکھی ہوئی بوتل قریب
قریب خالی ہو چکی تھی سحر کی قوس قزحی کرنیں کھڑکیوں سے اندر جھانکنے لگی تھیں اور شام صوفہ
پر بیٹھا مسرت اور رنج کے درمیانی وقفہ میں گھرا جا رہا تھا۔

جب گوپال جاگا، تب بھی شام اُسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے اُس کی انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"تم سوئے نہیں ۔۔۔؟"

شام کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"جلدی سے نہا دھولو۔ پھر چائے پیتے ہیں۔۔۔!"

گوپال آنکھیں ملتا ہوا غسل خانے کی طرف چل دیا۔ شام نے اپنے کپڑوں میں سے ایک جوڑا نکال کر اُس کے لئے بھجوایا۔۔۔ اور خود بھی مہینوں کی گرد کو اپنے جسم سے اُتارنے کیلئے چل دیا!

وہ تیار ہوکر ڈرائنگ روم میں پہنچا ہی تھا کہ بیلا داخل ہوئی۔ شام نے مڑ کر دیکھا۔۔۔ چہرے پر مسکراہٹ کھل اُٹھی۔۔۔! آج مہینوں کے بعد اُسے دیکھا تھا۔۔۔ بیلا حیران ہوکر اُس کی طرف دیکھنے لگی۔۔۔ شام سے اس طرح اچانک ملاقات کی اُمّید نہیں تھی۔۔۔

"کہاں رہے اتنے دن ۔۔۔؟"

"سکون کی تلاش میں ۔۔۔!" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

بیلا کیلئے شام کی مسکراہٹ ایک نئی چیز تھی۔۔۔ حیران ہوکر پوچھا۔۔۔

"مِلا ۔۔۔؟"

"شاید!" ۔۔۔ شام نے ہنس کر کہا۔

بیلا اُس کے بدلے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی۔۔۔ شام نے اُسے اِس طرح گھورتے ہوئے دیکھا۔۔۔ بولا۔۔۔

"ذرا ملازم سے کہو ہماری چائے یہیں لے آئے!"

"ہماری؟ ۔۔۔" بیلا کی حیرت اور بڑھ گئی۔

"ہاں! آج تم اور میں اکٹھے چائے پئیں گے!"

"نہیں ۔۔۔ ؟"

بیلا جیسے ایک دم آسمان سے زمین پر آ گری۔ شام اور اُس سے اس بے تکلفی سے پیش آئے ۔۔۔! آج وہ اُسے کچھ بدلا ہوا سا پا رہی تھی ۔۔۔۔۔۔

بیلا کو خاموش دیکھ کر شام نے خود ہی ملازم کو آواز دی۔ ملازم چائے کی کشتی میز پر سجا کر چلا گیا ۔۔۔ بیلا خاموشی سے چائے بنانے لگی۔ شام اُسے چائے بناتا چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

جب وہ واپس ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو اُس کے ساتھ گوپال تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر بیلا نے بڑے پر جھکی ہوئی نظریں اُٹھائیں ۔۔۔ چائے کی پیالی ہاتھ سے گر گئی ۔۔۔ وہ ایک دم گھبرا سی گئی ۔۔۔ اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا ۔۔۔ یہ خواب تو نہیں تھا! ۔۔۔ وہ جاگ رہی تھی ۔۔۔! پورے ہوش و حواس میں تھی! ۔۔۔۔ چائے کی پیالی واقعی اُس کے ہاتھ سے گری تھی ۔۔۔ اُس میں گر کر قالین میں جذب ہوتے والی چائے سے ابھی تک بھاپ نکل رہی تھی ۔۔۔ لیکن گوپال ۔۔۔۔۔؟ ۔۔۔ کیا شام واقعی ۔۔۔۔؟؟

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی شام کی طرف دیکھتی اور کبھی گوپال کی طرف! ۔۔۔۔۔

گوپال اُس کے سامنے شام کے پہلو میں کھڑا مسکرا رہا تھا ۔۔۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پھر جھک گئیں ۔۔۔ پھر ملیں ۔۔۔۔۔ اور بیلا بے اختیار دوڑ کر گوپال سے لپٹ گئی ۔۔۔ شام کی موجودگی کا احساس ہی مٹ گیا تھا ۔۔۔ شام نے نظریں جھکا لیں گھبرائی ہوئی آواز میں بولا ۔۔۔

"چائے پی لو۔" ٹھنڈی ہو رہی ہے ۔۔۔!" اور آہستہ سے کمرے کے باہر نکل گیا۔ آج وہ بے حد خوش تھا۔ آج اُس کا بیلا سے کیا ہوا وعدہ پورا ہو گیا تھا اُس نے گوپال کو تلاش کر کے بیلا کے حوالے کر دیا تھا۔ آج وہ بے حد غمگین تھا کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا

اپنی زندگی، اپنی محبت کو اپنے ہاتھوں سے دوسرے کے ہاتھ میں سونپ رہا تھا۔

آج پہلی بار اُس کی آنکھوں میں آنسو آئے، آج پہلی بار اُس نے اپنے سینے پر انگارے اور شبنم ایک ساتھ محسوس کئے، اور وہ اس تپش اور ٹھنڈک کے ملے جُلے احساس سے چور لان میں بچھی ہوئی نرم نرم گھاس پر ٹہلنے لگا۔

صبح کی ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ ساری کوٹھی کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُبھرتے ہوئے سورج کی سنہری گلابی کرنیں ایک جال سا بُن رہی تھیں، یوگ آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل دیا۔ بیلا اور گوپال کو ایک ساتھ بیٹھے دیکھ کر ہی سمجھ گیا کہ شام لوٹ آیا ہے۔ وہ خاموشی سے آگے نکل آیا۔ سامنے کونے میں بھولو چاچا اپنی جھاری لئے بیٹھا تھا۔ یوگ جھلّایا ہوا اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"بھولو چاچا! یہ سب کیا ہے؟"

بھولو چاچا نے اپنی مچی مچی آنکھیں اوپر اُٹھائیں۔ زور زور سے جھاری کے کش کھینچے اور سر ہلاتے ہوئے بولا —

"شام لوٹ آیا ہے گوپال کو لے کر!" — اُس کی آواز میں درد تھا۔ لہجہ میں شکایت تھی۔ جیسے کہنا چاہتا ہو، صرف تمہاری وجہ سے ہی تو یہ سب کچھ ہوا ہے صرف تم لوگوں کی وجہ سے میرا بھولا بھالا شام در بدر پھرتا رہا ہے۔ اور اب تم مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو کہ یہ سب کیا ہے؟ لیکن یوگ خود ہی اسی بات پر جھنجھلایا ہوا تھا۔ اُسے شام پر غصہ آ رہا تھا۔ اُس کے نزدیک یہ صرف جذباتی حماقت تھی۔ شام خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہا تھا — اُسے بیلا سے نفرت تھی — شام سے بھی نفرت ہونے لگی۔ جھنجھلا کر بولا —

"یہ کیا حماقت ہے! خود اپنے آپ کو کنوئیں میں گرا رہا ہے!"

بوڑھا بھولو چاچا کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔

"دل دریا سمندروں ڈونگھے۔ کون دلاں دیاں جانے؟"

یوگ پاؤں پٹختا ہوا آگے بڑھ گیا ــــ واقعی دل ایسا دریا ہے جو سمندروں سے بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس کی تھاہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ دل کی پہنائیوں میں اُٹھنے والے طوفانوں سے کون واقف ہو سکتا ہے ــــ؟"

یوگ سوچ رہا تھا ــــ یہ کیسی محبت ہے ــــ؟ یہ کیسا لگاؤ ہے؟؟ ــــ یہ کیا ہے، جو اپنے لئے کچھ نہیں چاہتا؟ ــــ یہ کیسا بندھن ہے، جو صرف لُٹنا سکھاتا ہے لوٹنا نہیں ــــ؟۔۔۔

وہ اپنے نائٹ گاؤن کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے شام کے سامنے کھڑا تھا ــــ ــــ سوچ رہا تھا ــــ یہ کیسے رشتے ہیں؟؟ ــــ جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ بن جاتے ہیں!۔۔۔۔۔ اپنا سب کچھ قربان کر دیتے ہیں!!۔۔۔۔۔ پیاسے رہتے ہیں، مگر دوسروں کی تشنگی برداشت نہیں کر سکتے! یہ کیسی زندگی ہے، جو صرف کھونا جانتی ہے!۔۔۔۔۔ جو صرف۔۔۔۔۔۔؟؟

اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس اندھی محبت، اس اندھے لگاؤ کا وجود تک مٹا دے! لیکن وہ خاموش رہا۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا ــــ شام کی اُجڑی ہوئی ویران آنکھوں میں جھانکتا رہا ــــ کسی سحر زدہ ہستی کی طرح اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

شام نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پیار سے بولا۔

"آؤ ــــ!"

یوگ چپ چاپ اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ شام سے اُلجھ جانا چاہتا تھا، مگر نہ جانے کیوں اُس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ شام کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ اور وہ شام کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ سارا

غصہ جیسے ایک دم کہیں اُڑ گیا تھا۔

بھولو چاچا نے دور سے دونوں کو سر ....

جھکائے کوٹھی کی طرف آتے دیکھا۔ اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو کوٹ کی

آستین سے پونچھا اور بڑبڑایا ــــ

"دل دریا سمندروں ڈونگھے......"

وہ دل، دریا اور سمندر کی کہانی بھی پوری نہ کر سکا۔ کھانستا ہوا وہیں فرش

پر بیٹھ گیا۔

گوپال کا آنا تھا کہ گھر بھر میں قیامت آگئی۔ بھولو چاچا ایک دم خاموش ہو گیا۔ ہر وقت گُڑگُڑی لئے کسی کونے میں پڑا رہتا۔ کسی سے بات تک نہ کرتا۔ بیلا کے پاپا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ یوگ تو پہلے ہی سے گوپال کے خلاف تھا۔ اُسے اچھی طرح جانتا تھا، اُس کی آوارگی اور اوباشی سے نالاں تھا۔ بیلا کے پاپا سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ مگر آخر باپ تھے۔ وہ اس بات کو کیسے بھول سکتے تھے کہ یہی گوپال اُن کی تباہی کا باعث بنا تھا۔ اُن کی عزت سے کھیل چکا تھا۔

گھر بھر میں اگر کوئی بیلا کا ساتھی تھا تو وہ شام تھا۔۔۔ اور پنڈت پیارے لال کو اُس پر بھی غصہ آ رہا تھا۔۔۔ اُن کے نزدیک یہ حماقت تھی، پاگل پن تھا کہ شام خود گوپال کو تلاش کر کے لائے۔ وہ اگر چاہتا تو بڑی آسانی سے بیلا سے ساتھ شادی کر سکتا تھا، دولت مند تھا۔ قبول صورت تھا۔۔۔۔ تعلیم یافتہ تھا۔۔۔۔۔۔ اگر وہ خود بیلا سے شادی کرنا چاہتا تو پنڈت پیارے لال ذات پات کی قطعی پرواہ نہ کرتے۔ بڑی خوشی سے اس کے ہاتھوں میں بیلا کا ہاتھ سونپ دیتے۔ اُن کے نزدیک شام ہر لحاظ سے گوپال سے

بہتر تھا ؟ پھر...... ؟؟ اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شام بیلا سے محبت کرنے کے باوجود اُس کی شادی گوپال سے کیوں کروانا چاہتا ہے؟ — اگر وہ ایک بار ہلکا سا اشارہ بھی کر دیتا، تو وہ بیلا کے لاکھ انکار کرنے پر بھی اُس کی شادی شام سے کر دیتے! — لڑکی کا دماغ تو چل ہی چکا تھا۔ لیکن شام!! —

وہ غصہ میں بھرے ہوئے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ ہاتھوں میں دبا ہوا سگار کب کا بُجھ چکا تھا۔ مگر اُنھیں اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ اُسے پھر سے سلگا تے۔ کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتے ہوئے اُن کی نظریں اپنے آپ بیلا پر جا پڑتیں، جو اِس طوفانِ غیض و غضب سے بے تعلق ہو کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور وہ اُسے اِس طرح گھورتے جیسے نظروں ہی نظروں میں اُسے چبا ڈالیں گے، اُن کی رفتار تیز ہو جاتی، اور وہ اپنے بُجھے ہوئے سگار کو دانتوں سے چبانے لگتے۔ پنڈت پیارے لال پنجرے میں بند شیر کی طرح بپھرے ہوئے تھے!

بیلا کے عین سامنے، کُرسی پر یوگ گھٹنوں کو سکیڑے بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھیں بیلا کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ نفرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اور شام خاموش کھڑا تینوں کو دیکھ رہا تھا۔ اُن کے چہروں کے اُتار چڑھاؤ کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا —

پنڈت پیارے لال ایک دم رُک گئے۔ بیلا کے سامنے کھڑے ہو کر بولے،

"یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں! —" پُرسکون جواب بولا۔

"اچھی طرح سوچ لو — !"

"میں بہت عرصہ سے سوچ چکی ہوں — !"

"اُسی گوپال سے شادی کرنا چاہتی ہو، جو تمھیں دھوکا دے کر بھاگ گیا تھا؟"

بیلا خاموش رہی۔

"یہ نہیں ہو سکتا ___ !" پنڈت پیارے لال گرجے ___ "میں اپنی عزت کو دوبارہ مٹی میں ملتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ___"

"یہ تو اب ہو گا ہی ___" بیلا نے اُسی طرح پُر سکون آواز میں جواب دیا۔

"میں تمہیں ایک آوارہ اور بدمعاش کے حوالے نہیں کر سکتا ___"

بیلا خاموش رہی۔

"ایک بار پھر سوچ لو! ___ ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا۔ گوپال تمہیں کچھ نہیں دے سکتا۔ وہ اپنا بوجھ تک نہیں سنبھال سکتا۔ وہ تمھیں کبھی نہیں اپنائے گا۔ پھر دھوکا دے گا ___!"

"میں اُسے اپنا چکی ہوں۔ وہ جیسا بھی ہے، جس حالت میں بھی ہے، میرا ہے۔"

"شام تم سے محبت کرتا ہے ___ تمہیں خوبصورت زندگی دے سکتا ہے ___!"

"میں گوپال کا آج تک انتظار کرتی رہی۔ اب وہ آ گیا ہے۔ تو ....."

"اگر وہ نہ آتا ___؟" یوگ نے پہلی بار زبان کھولی۔

بیلا خاموش رہی۔

"اگر وہ مر گیا ہوتا ___؟" یوگ اپنے غصہ اور نفرت کو نہ چھپا سکا۔

"دوسری بات تھی!" بیلا نے ٹھہری ہوئی آواز سے جواب دیا۔

پنڈت پیارے لال آپے سے باہر ہو گئے۔ اُن کا ہاتھ زور سے گھوم گیا۔ لیکن شام کے کندھے سے ٹکرا کر جھول گیا۔ شام نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا ___ سنجیدگی سے کہنے لگا ___

"طیش میں آنے والی بات نہیں ___! بات پسند اور ناپسند کی ہے ___! آپ لوگ جذباتی ہو رہے ہیں ___! بیلا بچی نہیں، جو کچھ کرے گی، سوچ سمجھ کر ہی کرے گی! پھر میرا تو سوال ہی نہیں اُٹھتا ___ ہمارا ملاپ کچھ بے جوڑ سا ہے، میں اس ماحول ہی سے

بے گانہ ہوں جس کی تلاش بیلا کو ہے ۔ پھر وہ کسی دوسرے کے ساتھ خوش کبھی نہیں رہ سکتی ۔ اور آپ کبھی اُس کی خوشی ہی چاہتے ہیں !"

"تمھیں نے اِس کا مزاج بگاڑ رکھا ہے ! اگر........." پنڈت پیارے لال کچھ اور بھی کہتے لیکن شام نے مہلت ہی نہ دی۔

گوپال ہر لحاظ سے بیلا کیلئے موزوں ہے ، راہ سے بھٹک ضرور گیا تھا۔ مگر سنبھل جائے گا ۔ اچھے خاندان کا لڑکا ہے۔ آپ کے ماحول کا پروردہ ہے ۔ پھر آپ ہی کی برادری کا بھی ہے ، بیلا اُسے سنبھال لے گی !"

یوگ ، بیلا اور پنڈت پیارے لال تینوں چپ چاپ اُس کی بجھی بجھی سی صورت دیکھ رہے تھے ۔ شام نے اپنی بات جاری رکھی ۔

"گوپال جیتا جاگتا ہے ۔ بیلا اُس سے محبت ہی نہیں کرتی ۔ اُس کی پرستش کرتی ہے ۔ آج تک اُس کا انتظار کرتی رہی ہے ۔ ! یہ وقت طیش میں آنے کا نہیں ، خوشی کا ہے ۔ آپ کی بیٹی آج مدتوں کے بعد مسکرائی ہے ۔ ایک طویل انتظار کے بعد اُس میں زندگی کی رمق پیدا ہوئی ہے ۔ ! آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ آپ کے سر سے ایک بوجھ اُتر رہا ہے ۔ !"

شام خاموش ہو گیا ۔ کسی کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا ، وہ صرف اُس کی بھرّائی ہوئی آواز میں کھوئے ہوئے تھے ۔ جو کہیں بہت دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ تینوں بُت بنے بیٹھے تھے ۔

بیلا حیران حیران سی نظروں سے شام کی طرف دیکھ رہی تھی ۔ پیارے لال سر جُھکائے کمرے سے نکل گئے ۔ یوگ خاموشی سے گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھا رہا ۔ شام نے ایک نظر یوگ پر ڈالی ۔ ایک نظر بیلا کی طرف دیکھا ۔ آنکھیں نمناک ہو گئیں ۔ نظر دھندلا سی گئی ۔ اُس نے زبردستی کی مسکراہٹ لاتے ہوئے بیلا کی دھندلائی

ہوئی پرچھائیں کو دیکھا۔ اور باہر نکل گیا۔!

ھنگامہ فرو ہو چکا تھا۔ پنڈت پیارے لال نے خاموشی اختیار کر لی۔۔۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ گوپال کی آمد و رفت بیلا کنج میں ایک معمول بن چکی تھی۔۔ وہ اب خود کو سنبھالے ہوئے تھا۔۔ بیلا کی شدید محبت اُس کے دل میں اثر کئے بغیر نہیں رہی تھی۔ اُس کی شراب نوشی میں بڑی کمی آ گئی تھی۔

شام ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو گوپال اور بیلا ایک ساتھ بیٹھے کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ اُسے دیکھ کر جھینپ سے گئے۔ شام آہستہ قدم چلتا ہوا اُن کے پاس آ کھڑا ہوا۔۔ بیلا سے بولا۔۔

"بیلا! میں نے وعدہ کیا تھا! اب پورا کر چکا ہوں!"

شام یہ کہہ کر گوپال کی طرف مڑا۔

"تم بڑے خوش قسمت ہو! بیلا کو تمھارے ساتھ دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ اسی میں بیلا کی خوشی ہے۔ اِس کی خوشی میں ہی میری بھی خوشی ہے۔۔! میری زندگی کو بھی ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اور پھر سہاروں کی کسے ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن میں یادوں کا انسان ہوں، سوچوں کا آدمی ہوں بچپن سے یہی حصّہ میں آئی ہیں۔ انھی کے سہارے زندگی کاٹ سکتا ہوں!۔۔۔"

بیلا اور گوپال دونوں اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آج میں بہت خوش ہوں۔۔"

اور وہ اپنی خوشی کا ثبوت دینے کیلئے زور سے قہقہے لگانے لگا۔ دیر تک ہذیانی انداز میں ہنستا رہا۔۔۔ مگر اُس کی ہنسی روتی ہوئی سی تھی، قہقہے

کھوکھلے تھے ..... زندگی ہی کھوکھلی ہو کر رہ گئی تھی ۔ شام اپنے اس کھوکھلے پن پر جی بھر ہنسا، جی بھر کر کھلکھلاتا رہا۔ دونوں پھٹی پھٹی سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے ۔۔ شام نے اپنی بات جاری رکھی۔

"آج میں بے حد خوش ہوں۔ زندگی میں پہلی بار مجھے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ آج پہلی بار جو کچھ چاہا ۔۔ ملا! آج میں اپنی پہلی فتح مناؤں گا۔ تمھاری آنے والی زندگی کی مسرتوں کا جام پیوں گا ۔۔ اور ...."

اُس کی آواز رُندھ گئی۔ گلا بھر آیا! اُس نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کی اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو چھپانے کیلئے سگریٹ سلگانے لگا ۔۔ تھوڑی دیر کمرے پر خاموشی طاری رہی ۔۔ گوپال اور بیلا خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتے رہے ۔۔ شام نے اس سکوت کو توڑا ۔۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم ایک خوبصورت سا سنسار بساؤ۔ اور بیلا کنج کے اس سنسار میں ایک خوبصورت سی بچی کھیلتی پھرے ..... یہ میری آخری تمنا ہے! ..... میں اُس دن کا انتظار کروں گا ۔۔!"

دونوں میں سے کوئی نہ بولا ۔۔ دونوں جیسے گہری سوچوں میں ڈوب سے گئے تھے۔

گوپال سوچ رہا تھا ۔۔ یہ کس دُنیا کا باسی ہے؟ کن آسمانوں کا رہنے والا ہے؟ .... جو اپنی زندگی دے کر دوسروں کو مسکراہٹ بخشتا ہے۔ اپنے زخموں پر مسکراتا ہے، اور دوسروں کی معمولی خراشوں کو دیکھ کر ہی تڑپنے لگتا ہے۔ اُن پر ٹھنڈا مرہم رکھتا ہے۔!

...... ایسے لوگ کہاں سے آجاتے ہیں؟ ؟ کہاں سے ؟؟

شام خاموشی سے سگریٹ کے طویل کش کھینچتا ہوا بیلا کنج سے باہر نکل گیا۔ دونوں اُسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے، کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ گوپال نے بیلا کی طرف مُڑ کر دیکھا ۔۔

"شام چلا گیا!" ـــ اُس نے بوجھل آواز سے کہا۔

"ہاں!" ـــ بیلا نے جواب دیا۔ اس کی نگاہیں خلا میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں؛

"تم نے روک لیا ہوتا!" گوپال نے اُسے جھنجھوڑا۔

"وہ نہیں رُک سکتا تھا۔ میں جانتی ہوں!" بیلا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے جلدی سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ آج پہلی بار اُس کی آنکھوں میں شام کیلئے آنسو آئے تھے؛ اُس نے کبھی بھی شام کے متعلق ہمدردی محسوس نہیں کی تھی۔ اُسے ہمیشہ خشم آلود نظروں سے دیکھا تھا۔ اُس سے ہمیشہ نفرت کی تھی۔ اُسے ہر بار شکست دینے کی کوشش کی تھی؛ اُسے کمتر سمجھا تھا ـــ

.....لیکن آج وہ محسوس کر رہی تھی، جیسے شام اُس سے کہیں بلند ہے۔ گوپال سے کہیں زیادہ اونچا ہے؛ اُسے شام سے محبت نہیں تھی لیکن اب اُس کے دل میں اُس کے لئے احترام کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ شام اُسے ایک فرشتہ نظر آنے لگا تھا ـــ وہ دیر تک کھُلے ہوئے دروازے کے اُس پار، دور اُفق میں گُم ہوتی ہوئی سڑک پر نظریں جمائے بیٹھی رہی، جس پر ابھی ابھی شام گذرا تھا ـــ اُس کی نگاہیں کولتار کی پختہ سڑک پر اُس کے قدموں کے نشان ڈھونڈتی رہیں ـــ اُسے جیسے احساس ہی نہیں رہا تھا۔ کہ گوپال اُس کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔

"شام ہمیں خوش دیکھنا چاہتا ہے!" وہ جیسے خواب میں بڑبڑائی ـــ

٥

٥٥٥

شام جو کپڑے پہنے ہوئے تھا، اُنہی کے ساتھ بیلا کنج سے نکل آیا تھا۔

نہ کچھ سامان لیا تھا اور نہ ہی ساتھی۔ صرف بھولو چاچا تھا، جو اپنے آپ ہی اُس کے پیچھے چل دیا

تھا۔۔ شام اکیلا، تنہا، اپنوں بیگانوں سے دور، بیلا کنج سے پرے، ایک نئی جگہ، نئے مکان

میں رہنے لگا۔ گوپال اور بیلا کو ملانے کے بعد جیسے ایک بھاری بوجھ اُس کے سر سے اُتر

گیا تھا۔ وہ نئے سرے سے، نئے ڈھنگ کے ساتھ زندگی شروع کرنے کی سوچ رہا

تھا۔ نیا سنسار بسانے کی سوچ رہا تھا۔

شام کا چوتھا گھر تھا۔ ایک گھر اپنے پُرانے شہر میں تھا۔ بیلا کے باپ کی اونچی

حویلی کے سامنے ..... ایک مختصر سا دو منزلہ مکان ..... جہاں وہ پل کر بڑا ہوا تھا۔

جہاں باپ اور ماں کا پیار ملا تھا۔ جہاں اب کوئی بھی نہیں تھا، جسے وہ اپنا کہہ سکتا تھا۔

دوسرا گھر بچپن کے اُنہی دنوں میں، اپنے خیالوں میں بسایا تھا، جہاں ......

صرف وہ تھا ..... بیلا تھی ..... بچپن کی کچی، خام تمنائیں تھیں۔ معصوم قہقہے تھے

اور ریت کے گھروندے! ۔۔ ریت کی خام، بھُربھری دیواروں کا بے رنگ محل

اپنی تمام معصومیت اور بے لوث محبت کے باوجود ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا نہ برداشت کر سکا۔ ریت کے گھروندوں کی طرح پھر ریت میں ہی مل کر رہ گیا۔

ریت کے گھروندے کی شکستہ دیواروں نے شام کو بے حس سا کر دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود نہ جانے کس موہوم سی اُمید پر اُس نے راجدھانی میں ایک نیا گھر بسایا تھا۔! اس کی دیواریں ریت کی نہیں تھیں۔ اُس کے بچپن کے خوابوں کی طرح کچی اور خام نہیں تھیں اس لئے گر تو نہ سکیں۔ مگر چھوٹ گئیں کیونکہ اس نئے خوبصورت اور پختہ مکان کی بیلا کو ضرورت تھی۔ بیلا کی کامیاب محبت کو ضرورت تھی۔ گوپال کو ضرورت تھی۔ اُن دونوں کے خوش آئند مستقبل کو ضرورت تھی۔ اور شام کے پاس اب نہ اُس کی محبت تھی اور نہ ہی کوئی مستقبل۔!

چوتھے گھر میں شام اپنی بچی کھچی یادوں کو سنبھالے بھولو چاچا کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ صرف ایک ہی خواہش تھی کہ گوپال جلد سے جلد بیلا سے منسلک ہو جائے۔ اسی لئے مکان ملتے ہی اُس نے گوپال کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ اور اُسے سدھارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ گوپال بھی اپنی پچھلی آوارہ اور گمراہ زندگی سے اُکتا چکا تھا۔ اُسے بدلتا ہوا نظر آتا تھا، وہ اب اپنا زیادہ وقت بیلا کنج میں بیلا کے ساتھ ہی گذارتا۔ یا شام کے پاس بیٹھا رہتا۔

گوپال کو نئے رنگ میں رنگتے ہوئے دیکھ کر رانی کو بھی ایک گونہ تسلی ہو رہی تھی وہ بھی گوپال کی بے راہ روی سے خوش نہیں تھی۔ وہ اُسے ہنستے مسکراتے ہوئے گھر میں دیکھنا چاہتی تھی۔ خود بے سہارا تھی، اکیلی تھی، اس لئے ہر گرتے ہوئے کو تھام لینے کے لئے دوڑ پڑتی تھی۔ سہارا دینے کے لئے بڑھ آتی تھی۔ گوپال کو اپنی طرح دنیا میں اکیلا تنہا دیکھا، بھٹکا ہوا پایا۔ تو اُسے سنبھالا دینے کیلئے بڑھ آئی۔ مگر وہ سنبھل نہیں سکا۔ وہ اُس کی حالت سے مایوس ہو چکی تھی۔ شام کی مدد سے اُسے راہ پر آتے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئی۔

رانی ایک مُدت تک گوپال کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ اُس سے ایک لگاؤ، ایک اُنس سا ہو گیا تھا ___ گوپال کی شادی بیلا سے ہو رہی ہے۔ وہ ہمیشہ کیلئے بیلا کو اپنا رہا ہے..... ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بیلا کا ہونے والا ہے ___ یہ سن کر اُسے دُکھ تو ضرور ہوا۔ لیکن یہ سوچ کر کہ گوپال خوبصورت زندگی شروع کر رہا ہے ___ پُرانی ڈگر کو چھوڑ رہا ہے، وہ کھِل سی اُٹھی ___ گوپال کی اوباش آوارہ زندگی نے اُسے کبھی یہ سوچنے بھی نہ دیا تھا کہ وہ کبھی اُس کا ہو سکے گا۔

رانی نہیں چاہتی تھی کہ گوپال کے سنبھلے ہوئے قدم پھر بہک جائیں! وہ پھر اُن اُلجھی ہوئی تاریک راہوں میں اُلجھ جائے۔ کوشش کرتی کہ اب گوپال کے سامنے نہ ہو راہ چلتے کہیں اچانک مل جاتا تو بچ کر کترا کر نکل جانے کی کوشش کرتی شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا۔ دونوں طرف سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مگر رانی اسی خوف سے شام کے گھر تک نہ گئی۔

جوں جوں شادی کی تاریخ نزدیک آ رہی تھی، شام کی مصروفیتوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دولہا کی طرف کا انتظام تو اُس کے سر پر تھا ہی۔ لیکن بیلا کی طرف کا سارا انتظام بھی اُس نے اپنے ذمہ ڈال لیا تھا۔ یوگ اور اُس کا باپ بھی انتظام کر رہے تھے۔ لیکن اُسے جیسے کسی پر بھروسہ ہی نہیں تھا۔ ہر کام اپنے سامنے کرانے کی کوشش کرتا۔ اُس کا ایک پاؤں اپنے گھر میں ہوتا اور دوسرا بیلا کنج میں! گوپال اور بیلا کی شادی میں اُس نے دن رات ایک کر دیا تھا۔ وہ اس لگن، اس محنت سے انتظام میں مصروف تھا کہ شاید اپنی شادی پر بھی اتنی محنت نہ کرتا!

شام اپنی ساری حسرتیں، سارے ارمان، جیسے بیلا کی شادی میں ہی پورے کر لینا چاہتا تھا۔ ہفتوں پہلے بیلا کنج اور شام کا نیا مکان دولہن کی طرح سجائے جانے لگے تھے ___ شادی کی چہل پہل، مہمانوں کی آمد کئی دن پہلے ہی شروع ہو چکی تھی اور اس

گہماگہمی کے ساتھ ساتھ شام کی مصروفیتیں بھی بڑھتی جارہی تھیں۔

صبح خلافِ معمول خنک اور خوش گوار تھی۔ مئی جون کی جھلستی ہوئی گرمیوں میں آسمان کا بادلوں سے گھرا ہونا معجزہ سے کم نہیں تھا۔ شام صبح کی ٹھنڈی شبنمی ہوا میں لان پر ٹہل رہا تھا۔ اُس کی نیند سے بوجھل آنکھیں رہ رہ کر بند ہونے لگتیں، وہ نہ جانے کتنی ہی راتوں سے متواتر اسی طرح جھپک جھپک کر جاگ رہی تھیں۔ مسلسل شب بیداری اور دوڑ دھوپ کا عکس اُس کے تھکے تھکے سُتے ہوئے چہرے پر نمایاں تھا۔ مگر وہ اس سے بے تعلق پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہل رہا تھا... آج وہ مکمل طور پر گوپال کو سیلا کے حوالے کردیگا۔ اُس نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو زور سے ملا۔

گوپال شب خوابی کے لباس میں آنکھیں ملتا ہوا اُس کی طرف آرہا تھا۔ شام نے اُسے دیکھا اور رُک کر سگریٹ سلگانے لگا۔۔۔ گوپال نے نزدیک پہنچ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔۔۔

"آج بھی نہیں سوئے ۔۔۔؟"

"شام نے اُس کی طرف سگریٹ کا پیکٹ بڑھادیا۔

"تمھاری آنکھیں بھی سرخ ہورہی ہیں!"....

"میں بھی نہیں سوسکا رات بھر!" گوپال نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں ۔۔۔؟"

"معلوم نہیں! ۔۔۔ بس نیند نہیں آئی ۔۔۔ ساری رات سینے پر ایک بوجھ سا محسوس کرتا رہا۔!"

"آج تمہاری شادی ہے!"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن پھر بھی......" اُس نے آسمان پر گھرے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا ہو رہا ہے! لیکن..... لیکن میں رات بھر سو نہیں سکا — ساری رات اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا!" —

شام اُس کے تھکے ہوئے چہرے کی طرف دیکھنے لگا — کسی بیمار انسان کا چہرہ تھا — مغموم..... زرد..... سُتا ہوا.....

"یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں پاگل ہو جاؤں گا —" گوپال رُک رُک کر بولا۔ پھر اپنی اُنگلیاں مروڑنے لگا۔ شام نے اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"میں سمجھتا ہوں، دل چھوٹا نہ کرو!"

"تم نہیں سمجھ سکتے! سچ کہتا ہوں — میرا دماغ ماؤف ہو جائے گا — مجھے وحشت ہو رہی ہے! تمہارا احترام کرنے لگا ہوں — لیکن اس حالت میں..... یقین کرو..... میں زندہ نہیں رہ سکتا! — مر جاؤں گا —! میرا سینہ کسی بھاری بوجھ کے نیچے دبا جا رہا ہے — تم نہیں جان سکتے یہ وقت مجھ پر کس قدر بھاری ہے —! میں اپنے آپ کو سنبھال نہیں سکتا! — آج اگر مجھے شراب نہ ملی تو میں مر جاؤں گا!" —

"لیکن آج شام تو......" —

"آج مجھے دولہا بننا ہے — لیکن کیا تم سوچ سکتے ہو کہ اس حالت میں میں وہاں تک پہنچ سکوں گا۔ وہاں جانے کیلئے ہی تو مجھے خود کو سنبھالنا ہے!"

اُس کی آواز میں بے پناہ درد تھا۔ شام اس سے ناواقف نہیں تھا۔ اُس کے اُجڑے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا —

"پی لو — مگر......"

"گوپال نے پوری بات نہ سُنی۔ اُس کی طرف متشکرانہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا اپنے کمرے میں لوٹ گیا۔۔۔ شام نے اُسے جاتے ہوئے دیکھا اور نیا سگریٹ سلگانے لگا۔

آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا تھا۔۔۔ شام کی موجودہ مالی حالت، اُس کا اثر رسوخ اور اُس کا خلوص ایسے تھے کہ راجدھانی کے معزز لوگ برات میں شرکت کے لئے آ رہے تھے۔ شام اِدھر اُدھر دوڑا پھر رہا تھا۔ کبھی مہمانوں کی خاطر داری میں مصروف ہوتا اور کبھی برات کے انتظام میں۔۔۔ دن ڈھلنے تک فرصت ہی نہ ملی کہ گھر کے اندر جا کر گوپال سے دو باتیں کر سکتا۔۔!

سارا آسمان گہرے سُرمئی بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی نے موسم کو اور بھی خوشگوار بنا دیا تھا۔ شام کے گھر میں عجیب رونق تھی۔ بھولو چاچا نئی وردی پہنے، کلف لگی پگڑی باندھے خود ایک دولہا لگ رہا تھا۔۔۔ رونق اور چہل پہل کے ساتھ ہی اُس کی عمر کئی برس پیچھے کی طرف دوڑ گئی تھی۔ اُس کے بوڑھے معصوم چہرے پر عجیب سی خوشی کھیل رہی تھی۔۔ بھولو چاچا اس بڑھاپے میں بھی بھولا بھالا بچہ تھا۔ جس کیلئے شادی بیاہ کی رونق، باجے گاجے، بے شمار خوشیاں لئے ہوتے ہیں۔ شادی کسی کی بھی ہو، برات کسی کی بھی چڑھے۔ وہ اُسی طرح جوش و خروش سے تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ بھولو چاچا منتظمِ اعلیٰ تھا۔ اپنی نئی خاکی وردی پر فخر سے نگاہ ڈال ڈال کر احکام صادر کر رہا تھا۔ اُسے یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی کہ یہ شادی اُسکے شام بابو کی نہیں، اُس کے دوست گوپال کی ہے، وہ صرف اس لئے خوش تھا کہ شام بابو خوش تھا۔

پنڈت آچکا تھا اور اب منڈپ کو سجائے گوپال کو دولہا بنانے کیلئے بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔ شام نے دولہا کو بُلانے کیلئے بھولو چاچا سے کہا۔

بھولو چاچا گوپال کے کمرے میں دیکھ کر واپس لوٹ آیا۔۔۔ گوپال وہاں نہیں تھا۔ شام نے گھر کے ہر حصہ میں آدمی دوڑائے۔ خود بھی مکان کا کونہ کونہ چھان مارا۔ گوپال

کہیں نہیں ملا! ــــ شام پر قیامت ٹوٹ پڑی ــ بدحواس ہو کر چاروں طرف دوڑنے لگا ــــ

برات آٹھ بجے بیلا کنج میں پہنچی تھی ۔ اب دس بج رہے تھے ۔ مگر گوپال کا کچھ پتہ نہ تھا۔ براتی پریشان ہونے لگے ــــ بارش شدّت اختیار کرنے لگی۔ سارا انتظام درہم ہو گیا ــ بادل رہ رہ کر زور سے گرجتے، اور سیاہ تاریک آسمان میں کڑکڑاتی ہوئی بجلی کی لہر سی دوڑ جاتی ــ بارش کے ساتھ ساتھ ہوا کبھی شدّت آنے لگی ۔ آندھی، بارش اور طوفان میں سب اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے ۔ شام کو خیال آیا : گوپال کہیں بدمستی کے عالم میں اکیلا ہی بیلا کنج کی طرف نہ نکل گیا ہو ۔ ؟ ــ یہ خیال آتے ہی شام بھاگ کھڑا ہوا اور ٹیکسی لے کر بیلا کنج کی طرف چل دیا۔

گوپال نے نہ جانے اُس سے کب کا بدلہ لیا تھا؛ لیکن آج کی رات جیسے قدرت بھی اُس سے انتقام لے رہی تھی ۔ بارش اس قدر تیز تھی کہ سڑکوں کی روشنیوں اور ٹیکسی کی ہیڈ لائٹوں کے باوجود راستہ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ ٹیکسی بڑی مشکل سے رینگ رہی تھی ، وقت جیسے پر لگا کر اُڑتا جا رہا تھا، ــــ اور شام پچھلی سیٹ پر بیٹھا پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ بیلا کنج تک کا پندرہ منٹ کا راستہ بڑی مشکل سے ایک گھنٹہ میں طے ہوا ۔ اور بارش کی بوچھاڑ کے درمیان سے بیلا کنج پر لگی ہوئی قمقموں کی لڑیاں دُھندلی دُھندلی سی دکھائی دینے لگیں ــــ

شام نے بیلا کنج کے سامنے ٹیکسی رُکوائی ۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا ۔ دور کہیں بجلی گری ۔ بڑی کڑک کی آواز آئی ــــ اس کے ساتھ ہی بارش اور طوفان میں ایک دم تیزی آئی ۔ پانی کی بوندیں گولیوں کی طرح سنسناتی ہوئی اُس کے جسم سے ٹکرانے لگیں ۔ بیلا کنج میں لگے ہوئے شامیانے بادلوں کی گرج کے ساتھ ہی کسی بچّے کے چھاتے کی طرح اُڑ کر دور جا گرے ۔ برات کے کھانے کیلئے میزوں پر سجائے ہوئے چینی کے برتن اِدھر اُدھر لڑھکنے لگے ۔

شام کو اس تیز آندھی میں سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہوگیا ـــ پھر ایک دم اندھیرا چھا گیا۔ ساری بتیاں ایک دم بجھ گئیں ـــ مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے ۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی ۔ اور خوفناک بارش! بجلی کی چمکتی ہوئی لہریں کسی آتشین مخلوق کی زبان کی طرح زمین کی طرف لپکتیں اور پھر اندھیرے کے منہ میں چھپ جاتیں ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سارا شہر پلک جھپکنے کی دیر میں بہہ جائے گا۔

شام بارش اور آندھی کی پرواہ کئے بغیر بیلا کنج میں داخل ہوگیا۔ دوڑتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ گوپال یہاں نہیں تھا۔ وہ چاروں طرف اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا ـــ لوگ پریشانی کی حالت میں ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک تو برات کے آنے میں غیر معمولی تاخیر سے حیران تھے ـــ دوسرے بارش اور طوفان کی وجہ سے آنے والی تباہی کے ہاتھوں پریشان ہو رہے تھے لیکن اس تمام مجمع میں گوپال کہیں بھی نہیں تھا۔

شام کے تنہا بیلا کنج میں پہنچنے پر ایک کہرام سا مچ گیا۔ آن کی آن میں یہ خبر بیلا کے کانوں تک بھی جا پہنچی۔ وہ اس وقت اپنی سہیلیوں میں گھری برات کے آنے میں دیر ہو جانے کی وجہ سوچ رہی تھی۔ شام ادھر اُدھر دوڑتا پھرتا اُس کے کمرے میں بھی آپہنچا۔ سُرخ جوڑے، ہلکے میک اپ اور قیمتی زیوروں میں سجی ہوئی بیلا سمٹی سکڑی بیٹھی تھی ۔شام کو اس طرح بھیگا ہوا اور پریشان حال دیکھ کر دھک سے رہ گئی ـــ ٹکٹکی لگا کر اُس کی طرف دیکھتی رہی، اور پھر ایک دم بے ہوش ہو کر لُڑھک گئی۔

شام جیسے بے حس سا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کی ہری بھری آرزوؤں کا رنگ محل زمین سے آ لگا تھا۔ بیلا کے بے ہوش ہو جانے پر سارے گھر میں چیخ و پکار مچ گئی دیکھتے دیکھتے ہنستا بولتا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

چاروں طرف تاریکی گھن گرج اور بارش کا راج تھا ــــــ

...... شام تھکے ہوئے احساسات سے بیلا کنج کے باہر نکل آیا۔ چُپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ کر واپس چل دیا، اُسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا ــــ اُس نے کیوں گوپال کو اجازت دی کہ وہ شراب پی لے ــــ ؟ کیوں نہ اُسے منع کر دیا ؟ ؛ وہ مر تو نہ جاتا ! ــــ لیکن وہ گیا کہاں ؟ ــــ

ــــ اُسے خیال آیا، گوپال کہیں رانی کے ہاں نہ پہنچ گیا ہو ! ــــ لیکن رانی ؟ ــــ وہ رانی کو کہاں تلاش کرتا ؛ ــ آجتک اُس کا پتہ تک نہ پوچھا تھا ــــ ! کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی کہ رانی کے گھر کا پتہ کرے ! ــــ

• • •

گوپال شام سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں پہنچا تو اُس کے ذہن پر جیسے سینکڑوں من بوجھ رکھا ہوا تھا ــــ اُس کی ساری سوچیں ختم ہو چکی تھیں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی جیسے اُس سے چھن گئی تھی۔ اُسے اپنے چاروں طرف سوائے گھور اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اُس کا سر بُری طرح چکرا رہا تھا۔ ہر چیز تیزی سے گردش کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ــــ

ــــ آج اُس کی شادی تھی ــ اُسی بیلا سے، جسے وہ محض ایک کھلونا سمجھا تھا۔ کھلونا ہی سمجھ کر اُس سے کھیلتا رہا تھا ــ اور کھیل کر، اُکتا کر، اُسے اُسی طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا! ــــ .... آج اُس کی شادی تھی ــــ! آج اُسے بہت بڑی شکست ہوئی تھی۔ وہ بیلا سے شادی کرنے جا رہا تھا، جسے وہ عرصہ ہوا فراموش کر چکا تھا۔ جو ایک مختصر سے وقفہ کیلئے اُس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی ــــ .... چند قدم ساتھ چلی تھی ــــ صرف چند قدم!! ــــ اور پھر دور، بہت پیچھے ماضی کے سایوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی ــــ بچھڑ گئی تھی! اور وہ اُسے چھوڑ کر بہت دور، بہت آگے نکل آیا تھا۔ نئے ہمسفروں

نئے ساتھیوں کے ساتھ جو بیلا ہی کی طرح صرف چند قدم تک اس کے ساتھ چلے تھے، اور پھر بیلا ہی کی طرح پیچھے رہ گئے تھے، وہ تیز دوڑنے کا عادی تھا۔ واپس لوٹنا نہیں جانتا تھا۔ لیکن وہ واپس لوٹ رہا تھا ــــ کئی برسوں کا طویل فاصلہ طے کر کے راہ میں بچھڑ جانے والی بیلا کے پاس واپس جا رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ تھامنے کیلئے! ــــ اپنے جیون کا مستقل ساتھی بنانے کیلئے! ــــ پہلی بار!! ــــ زندگی میں پہلی بار اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تھا پہلی بار اُسے اپنے ماضی کو بُلانا پڑا تھا۔! ــــ کسی کیلئے راہ میں رُک جانا اُس کا انتظار کرنا، اُسے آواز دینا اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ مگر آج ــــ !!؟ ــــ

گوپال کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ بڑی مشکل سے کمرے تک پہنچا اور آتے ہی برانڈی کی بوتل کو منہ سے لگا لیا۔ دو تین بڑے بڑے گھونٹ بھر کر اُس نے بوتل کو میز پر رکھ دیا۔ نائٹ گاؤن کی آستین سے ہونٹ صاف کئے اور آہستہ سے ایک آرام کرسی میں دھنس کر گلاس میں مزید شراب اُنڈیلنے لگا۔ برانڈی کے چند گھونٹ لینے کے بعد اُس کے جسم میں کچھ توانائی سی آ گئی ــــ رگوں میں خون کی روانی کچھ تیز ہو گئی۔ اور وہ اپنے آپ کو پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگا۔

وہ اپنے آپ کو سنبھالنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو حالات سے صلح کرنے کیلئے تیار کرنا چاہتا تھا' وہ چاہتا تھا کہ اُس کے اندر کا گوپال' باغی گوپال کسی طرح، کسی بہانے کچھ دیر کیلئے سو جائے۔ وہ جو کبھی ایک جگہ رُکنے کا عادی نہ تھا، کچھ عرصہ کیلئے ساکن ہو جائے۔ کچھ عرصہ کیلئے ...... کم از کم آج جمعہ ہی کے دن وہ اپنے ماضی کو بھول جائے۔ ماضی جو بڑا خوبصورت تھا!' ــــ ماضی ..... جو بڑا گھناؤنا تھا ــــ !! ...... ماضی ' جو .... !؟؟

گوپال نے گلاس میں اُنڈیلی ہوئی برانڈی ایک ہی سانس میں نگل لی ــــ اور اپنے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو دوبارہ اپنی آستین سے رگڑنے لگا ــــ اس کے جسم میں ایک

جھرجھری سی آگئی۔ اور وہ دونوں ہاتھوں میں سر کو تھام کر میز پر جھک گیا۔ وہ کسی بھی حالت میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کی منزل بخیر و خوبی طے ہو جائے۔ اور اُس کے لئے اپنے آپ پر قابو پانا ضروری تھا۔ گوپال چاہتا تھا کہ وہ ماضی کو بھول جائے ___ ان تمام جھروکوں کو بند کر دے جن میں سے اُس کے ماضی کی یادیں سر نکال نکال کر اُسکے ذہن میں جھانکنے لگی تھیں۔

___ مگر تین چار پیگ برانڈی پینے کے بعد بھی اُسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوا۔ شراب کے رگوں میں سرایت کرتے ہی یادوں کی ایک آندھی سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور ان تمام دروازوں اور دریچوں کے پٹ کھڑ کھڑا کھڑ کھڑا کر زور زور سے کھولنے لگی جنہیں وہ بند کرنا چاہتا تھا۔ ماضی کے تمام منظر.... تمام تصویریں ایک ایک کر کے اُس کی نظروں کے سامنے آنے لگے۔ برانڈی کے تیز اثر نے ان نقوش، ان تصویروں کو دھندلانے کے بجائے۔ واضح کرنا شروع کر دیا۔ ان میں جان ڈال دی۔

ایک ایک کر کے تمام نقش اُجاگر ہو رہے تھے اور وہ اُنھیں مٹانے کیلئے پیگ پر پیگ پی رہا تھا ___

ایک گھونٹ!

___ بیلا اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔ چھوٹی سی، ہلکے گلابی فراک میں ملبوس بیلا! ___ دوسرا گھونٹ! ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے سنگ مرمر کا حسین مرقع..... بیلا!! ___ تیسرا گھونٹ...... بیلا اُس کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہ کار چلا رہا تھا۔ اور سڑک کے کنارے اُس کا عزیز ترین دوست، بچپن کا ساتھی شام حسرت زدہ نظروں سے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا!؟ ___

دوسرا پیگ!......

___ سانولے رنگ کی دُبلی پتلی شاہنا اپنی مخصوص مسکراہٹ لئے اُس کی طرف

دیکھ رہی تھی، ــــ اُس نے ایک ہی بار سارا گلاس حلق میں اُنڈیل لیا۔

تیسرا پیگ! ــــ

نائٹ کوئن کلب کی روحِ رواں ریٹا، اپنی دونوں باہیں پھیلائے اُس کی طرف بڑھنے لگی ــــ اُس نے اپنی دونوں آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ لیکن ریٹا کا ہیولا اُسکی نگاہوں سے دور ہونے کا نام نہیں لیتا تھا ــــ ....

ریٹا ایک بڑے افسر کی مغرب زدہ لڑکی تھی۔ اُس کی بہت سی شاموں کو رنگین بنانے اور بہت سی جائیداد کو شراب میں تبدیل کرنے کا باعث بنی تھی! ــــ گوپال نے اپنے گلاس کی بچی کھچی شراب جلدی سے حلق کے نیچے اُتاری اور گلاس کو بھرنے لگا۔

گلاس میں ترشے ہوئے بالوں والی مس فیروزجی اپنے زرد چہرے کے ساتھ اُسکی طرف جھانکنے لگی۔ گوپال گھبرا اُٹھا ــــ بوتل میں پڑی ہوئی شراب کی سطح آہستہ آہستہ نیچی ہورہی تھی۔ اور گوپال کا ماضی آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا ــــ ان گنت چہرے .... ان گنت صورتیں اُس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ اُسے گھیر رہی تھیں! اپنی تمام اداؤں کے ساتھ! تمام معصومیتوں کے ساتھ اُسے اپنی طرف بُلا رہی تھیں ــــ ... صورتیں ــــ جنہیں اُس کی ہر لااُبالی حرکت پر خوشی ہوتی تھی ــــ جو اُس کے نزدیک آنے کیلئے بے چین رہتی تھیں! چہرے .... جو وقتی سہاروں کی تلاش میں اُس کی طرف بڑھے تھے ــــ صورتیں جو اپنے سارے خلوص کے ساتھ اُسے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اپنانا چاہتی تھیں ــــ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اُس کی ہو جانا چاہتی تھیں۔ جو اُس کی بے شمار دولت سے متاثر تھیں.... اُس کی جاذب شخصیت سے متاثر تھیں اور جو ــــ ؟

ــــ لیکن گوپال ایک بہتا ہوا جھرنا تھا۔ پہاڑی نالہ تھا ــــ جو کسی ایک ہی جگہ پر رُک جانا، ایک ہی مقام پر مقید ہو جانا نہیں جانتا۔ اور بڑی تیزی سے بھاگتا ہی رہتا ہے ــــ اُسی بھاگ دوڑ میں اُس کا پہلا سا شباب، پہلی سی رفتار، پہلا سا جوش و خروش .... سب

ختم ہو جاتے ہیں!

اسی بھاگ دوڑ میں گوپال کا بھی سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔۔ زمینیں، جائیداد، ....
موٹر .... بنگلے ..... سب آہستہ آہستہ اُس کی بے ہنگام اور تیز زندگی کی نذر ہو چکے تھے
اُس کی زندگی کیلئے پٹرول مہیا کرنے میں ختم ہو چکے تھے۔ اور اب کچھ بھی باقی نہ تھا۔

گوپال نے ایک اور پیگ گلاس میں انڈیلا۔۔ اب اُس کا سر بھاری ہونے لگا تھا۔
پپوٹے اپنے آپ بند ہونے لگے تھے۔ اُس نے سگریٹ اُٹھانے کیلئے میز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
اُس کا ہاتھ بھی بہکنے لگا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ واقعی زیادہ پی گیا ہے اور کافی نشہ میں ہے
لیکن یہ کیسا نشہ تھا۔ کیسی شراب تھی ———— ؟ یہ کیسا بہکنا تھا؟! —— وہ جو
کچھ بھولنا چاہتا تھا۔ جس زندگی کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح
اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی! ۔ ایک ایک نقش واضح اور صاف تھا!! اُس نے سگریٹ کے
طویل کش لے کر دھوئیں کے مرغولے چھوڑنے شروع کر دئیے، جیسے دھوئیں کے بادلوں میں اپنی
گذشتہ زندگی کو چھپا دینا چاہتا ہو —— لیکن دھوئیں کے غبار بھی اُس کے چاروں طرف رقص کرتے
کرتے ایک نیا باب کھولنے لگے —— اور ایک نئی صورت اُبھرنے لگی ——

"رانی! —— !!

—— —— رانی کا ہمدردی اور خلوص سے پُر پیکر اُس کے سامنے مسکرا رہا تھا۔
رانی جو اُس کی بھرپور زندگی کی شام میں ملی تھی۔ جب وہ سب کچھ ختم کر کے ایک لُٹے ہوئے
مایوس جواری کی طرح زندگی سے بیزار ہو چکا تھا۔ جب اُس کے پاس اپنا کہنے کو کچھ بھی نہیں
رہا تھا۔ جب وہ بالکل نادار تھا —— زندگی کی تیز دوڑ میں تھک کر گرنے کو تھا کہ رانی نے اسکے
لڑکھڑاتے ہوئے وجود کو سہارا دیا —— جو بغیر کسی اُمید کے اُسے سنبھالے ہوئے تھی۔ اُسکی
شکستہ زندگی کو سہارا دے رہی تھی۔ جو بلا ناغہ ہر شب کلب کے دروازے پر آکھڑی ہوتی۔
اور اُس کے شراب سے چور لڑکھڑاتے ہوئے جسم کو سہارا دے کر اپنے گھر لے جاتی۔ اُس کے

بے ہوش جسم کو پلنگ پر ڈال کر جوتے اُتارتی، اور پھر دیر تک اُس کی حالت پر روتی رہتی ۔ جسے اُس نے کبھی کچھ نہیں دیا. بلکہ اپنی آوارہ زندگی کا سارا بوجھ بھی اُس کے کندھوں پر ڈال رکھا تھا جس نے کبھی اُس سے کچھ نہیں مانگا ۔ کچھ نہیں چاہا! ۔ جس نے اپنی خون پسینے کی کمائی کا بیشتر حصہ اُسکی شراب نوشی اور دیگر فضولیات کی نذر کیا اور خود ہمیشہ انتہائی سادگی میں گذر کرتی رہی!"

رانی کا معصوم پیکر اُس کی مُندی ہوئی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ اپنی دلآویز مسکراہٹ لئے ۔ جیسے کہہ رہا ہو ۔

۔۔ "تو آخر تم مان ہی گئے ۔ ! بیلا سے شادی کرنے کو تیار ہو گئے؟ ۔۔ اور میں یکسر تمہارے ذہن سے اُتر گئی! ؟ کیا یہی صلہ ہے میری بے لوث خدمت کا؟ میری بے غرض محبت کا یہی انعام ہے؟؟ ۔ کیا میں اسی لئے تمہیں سنبھالے ہوئے تھی۔ سہارا دئے ہوئے تھی کہ سنبھلتے ہی تم مجھے بھول جاؤ ۔ اور بیلا کی آغوش میں جا گرو۔ ؟؟ ۔

گوپال اپنے حواس کھو چکا تھا۔ شراب کی زیادتی نے اُس کے سارے اعضاء کو سُن کر دیا تھا۔ آنکھیں دیکھ رہی تھیں ۔ چاروں طرف گھوم رہی تھیں ۔ مگر اُن پر بھی شراب غالب تھی۔ وہ بڑی شدت سے بہکنے لگا تھا چاروں طرف اُسے سوائے رانی کے اور کچھ بھی نظر نہ آرہا تھا۔ دیواروں پر ۔ کرسیوں پر ۔ ہر جگہ اُسے رانی کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیتا۔ رانی اُس کے مدہوش حواس پر چھا گئی تھی ۔۔ ......

۔۔ اب وہ سب کچھ بھول چکا تھا، شام کی تنبیہہ، اپنی شادی، .... بیلا سے کئے ہوئے وعدے ......، ہر چیز اُس کے ذہن سے اُتر چکی تھی۔ لیکن رانی ۔۔ !!

وہ لڑکھڑاتا ہوا کرسی سے اُٹھا اور بڑی مشکل سے بہکتے ہوئے قدموں کو سنبھالے اپنے کمرے سے باہر نکل آیا ۔ باہر ہر طرف چہل پہل اور بھیڑ تھی۔ سب اپنی اپنی دُھن میں مگن شادی کے انتظامات میں دوڑ بھاگ رہے تھے۔ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی ۔۔

اُس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی ؛ شام کے چھ بج چکے تھے ۔ وہ سب کی نظروں سے
بچتا ہوا کھسک گیا ۔ اُس کے قدم اپنے آپ رانی کے مکان کی طرف اُٹھنے لگے ۔ اُسے
یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے رانی اُس سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر کھڑی اُسے اپنی
جانب بُلا رہی ہے ۔ بازو پھیلائے اُس کی طرف دیکھ رہی ہے ! ـــــ اور وہ بے اختیار
اُس کی طرف کھنچتا چلا گیا ـــــ !؟

گوپال جب رانی کے گھر پہنچا ۔ تو وہ کہیں جانے کی تیاری کر رہی تھی ۔ گوپال
کو دیکھتے ہی سکتہ میں آگئی ۔ جس بات سے ڈرتی تھی وہی ہوئی تھی ۔ محض اسی ڈر سے
وہ گوپال سے ملنے میں جھجکتی تھی ۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ گوپال کے سنبھلے ہوئے شب و روز
پھر اُسی طرح ڈگمگانے لگیں ۔ وہ حیرت سے اُس کی طرف دیکھنے لگی ۔ اُس کی سمجھ میں نہیں
آ رہا تھا کہ کیا کرے ! اُس نے گھبرا کر گھڑی کی طرف دیکھا ؛ آٹھ بج چکے تھے ، اور آٹھ
بجے گوپال کو دولہا بن کر بیلا کے ہاں ہونا چاہیے تھا ـــــ !؟

رانی بڑی باہمت لڑکی تھی ۔ شروع ہی سے حالات سے لڑتی جھگڑتی چلی آئی تھی ۔
مشکل سے مشکل وقت میں بھی اُس کا ذہن قابو میں رہتا تھا ۔ مگر [illegible] وقت اُس کے ہاتھ
پاؤں بھی پھول رہے تھے ۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی ۔ [illegible] نے اپنی
دونوں مُٹھیاں زور سے بھینچ لیں اور ہذیانی آواز میں چیخ پڑی ـــــ

" یہاں کیوں آئے ہو ؟ "

لیکن اس وقت تک گوپال اُس کے پلنگ پر لیٹ چکا تھا اور بالکل بے ہوش
ہو گیا تھا ۔ اُس کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آگئی ۔ گوپال بدستور لیٹا رہا ـــــ
رانی نے اُسے زور زور سے جھنجھوڑا ۔ مگر وہ گہری نیند سو رہا تھا ـــــ اُس کے جھنجھوڑنے

یا چیخنے کا کچھ اثر نہ ہوا۔ رانی نے بے بسی سے اُس سہمے سوئے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا، گوپال کے چہرے پر بڑی معصوم اور دلآویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی! جیسے کوئی بچّہ مدّت کے بعد اپنے گھر میں لوٹ کر آیا ہو۔۔۔ اور سوتے میں کوئی خوبصورت خواب دیکھ کر مسکرا رہا ہو۔۔۔

رانی اُس کی طرف تشویشناک نظروں سے دیکھتی رہی۔ دیر تک بُت بنی کھڑی رہی۔ اُسے خیال آیا کہ بھاگ کر شام کے ہاں جا پہنچے، اور اُسے اطلاع کر دے کہ گوپال شراب سے بے ہوش ہو کر اُس کے گھر میں سو رہا ہے۔ اُسے شام کی پریشانی کا اندازہ تھا۔ جانتی تھی کہ وقت پر برات ببلا کے گھر پر نہ پہنچی تو اُس کی کیا حالت ہو گی!۔۔۔ وہ عورت تھی۔ عورت کے احساسات کو سمجھتی تھی!۔۔۔ اُس نے شام کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوئے ہوئے گوپال کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور دروازہ کی جانب بڑھ گئی۔ لیکن دروازہ میں سے گزرتے ہوئے اُس کی نظریں گوپال پر پڑیں تو اُس نے شام کے ہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ زیادہ شراب پینے کی وجہ سے گوپال کے بے ہوش چہرے پر طرح طرح کے نقوش بننے مٹنے لگے تھے۔ اُس کے چہرے پر کبھی کرب کی اذیت ناک پرچھائیں دکھائی دیتی اور کبھی ایک تکلیف دِہ تناؤ۔۔۔! پہلے کی سی مسکراہٹ کا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔

رانی کے بڑھتے ہوئے قدم اپنے آپ رُک گئے۔ وہ اُسے اس حالت میں چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جا سکتی تھی، دل مسوس کر رہ گئی۔۔۔ بے بس سی ہو کر گوپال کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور اُس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی۔۔۔

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔۔۔!

●●●

بیلا کنج میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن شام کے اپنے نئے مکان میں مرگ آلود سناٹا تھا۔ بارش برس رہی تھی۔ لیکن بے آواز۔ وہ گھن گرج کہیں نہ تھی۔ جو اس قسم کی برستی راتوں کا طوفان اپنے ساتھ لاتا ہے۔ چند لمحے پہلے جو ہولناک طوفان شام کے سینے میں موجزن تھا۔ وہ بھی اب خاموش ہو چکا تھا۔ چاروں طرف ایک مہیب، بے آواز اندھیرا تھا۔ جس نے ہر متحرک چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔

شام اندھیرے کے خاموش سمندر میں ڈوبتا اُبھرتا اپنے کمرے تک پہنچا۔ کہیں بھی کوئی جانی پہچانی صورت نہ تھی۔ البتہ دروازے کے باہر بھولو چاچا دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے سائے سے ڈر گئے۔ یکبارگی چونک اُٹھے۔ جیسے اچانک کسی طوفانی منجدھار میں ٹکراؤ ہو گیا ہو۔

شام نے بمشکل آواز نکالی۔

"کتنی بھیانک رات تھی!۔"

بھولو چاچا نے بھرائی ہوئی آواز سے اپنی کہی۔

"کب تک دوسروں کے اندھیروں میں اپنے سویرے ڈھونڈھو گے! کب تک دوسروں کے رنگ پالتے رہو گے؟ کبھی اپنی سُدھ بھی لو!"

شام اُس کے کندھے کا سہارا لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"آج میں اپنے آپ سے بھی ہار گیا۔ آج مجھے یقین ہو گیا کہ میں ایک بہت بڑا بدقسمت انسان ہوں!"

بھولو چاچا نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ بولا۔

"میں آج تک نہیں ہارا۔ لیکن آج میں نے بھی محسوس کیا کہ میں ہار گیا ہوں۔ میں نے اپنا قیمتی اثاثہ لٹا دیا۔ میں نے ایک لمبا دُکھی جیون گذارا ہے۔ لیکن سُکھی موت مرنے کی آس تھی۔ لیکن تم......"

وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دروازہ کے ساتھ ہی ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

شام پاس پڑے صوفہ میں دھنس گیا۔ اُس کا دماغ معطل ہو چکا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں ہی جواب دے گئی تھیں۔ وہ ایک کورا کاغذ تھا جس پر کوئی تحریر، کوئی نقش، کوئی نقطہ تک دکھائی نہ دیتا تھا۔ صرف آنکھیں کھلی تھیں اور متواتر سامنے کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ بے وجہ۔ بے مقصد، کھڑکی کے اُس پار باہر اندھے اندھیرے خلاؤں میں گھور رہی تھیں۔ مسلسل بیداری اور دوڑ دھوپ کی تکان کے باوجود جھپکنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ نیند کوسوں دور چلی گئی تھی اور جسم میں ایک تناؤ سا آ گیا تھا۔

بھولو چاچا کے دل میں بہت سی باتیں تھیں۔ اُس نے برستی بارش کے اندھیروں میں اکیلے بیٹھے شام کے بارے میں بہت کچھ سوچا تھا، بہت سے فیصلے کئے تھے۔ لیکن اُسے دیکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔

رات اُتر گئی۔ صبح کا اجالا کسمسانے لگا۔

یکایک دروازے کی گھنٹی بجی ۔ بھولو چاچا جیسے خواب دیکھ رہا تھا ۔ جیسے خواب میں بیلا اور شام کی آمد کا انتظار کر رہا تھا ۔ دروازہ کی جانب لپکا ۔

سامنے رانی کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھی ۔ اُس کے ساتھ ہی دیوار کا سہارا لیے گوپال کھڑا تھا ۔ دونوں کو دیکھتے ہی بھولو چاچا سر لٹکائے لوٹ آیا ۔

شام نے تھکی آواز سے پوچھا ۔

"دروازے کی گھنٹی بجی تھی ۔ لیکن تم خاموش ہو ۔ کہیں ......"

بھولو چاچا دوبارہ دروازے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا ۔

"گوپال آیا ہے ۔"

شام جیسے خواب دیکھ رہا تھا ۔ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا ۔

"گوپال ؟"

بھولو چاچا نے اُسی رو میں جواب دیا ۔

"ہاں ۔ گوپال ! لیکن رانی کے ساتھ ، شاید دونوں نے بیاہ کر لیا ہے ۔"

شام نے کچھ بھی نہ سُنا ۔ باہر کی جانب لپکا ۔

"گوپال" ۔

گوپال خاموش رہا ، رانی اُسے سہارا دے کر شام کے پاس لے آئی ۔

"اِسے اندر لے چلو ۔"

شام چیخا ۔

"لیکن یہ سب کیا ہوا ۔ کیسے ہوا ؟ ۔ اب اِسے یہاں کیوں لائی ہو !"

رانی نے گوپال کو سنبھالتے ہوئے کہا ۔

"اندر چلو" ۔

دونوں گوپال کو سنبھالتے ہوئے کمرے میں لے آئے ۔ اُسے چارپائی پر لٹا دیا ۔

رانی بھی ہانپتی کانپتی صوفہ پر بیٹھ گئی ۔ شام نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"اب اِسے یہاں کیوں لائی ہو؟" اب فائدہ کیا ہے؟؟ قصہ ختم ہو گیا!۔"

رانی نے گھبرائی ہوئی آواز میں سارا قصہ سنایا۔ سب ہی بے قصور تھے۔
صرف بیلا قصوروار تھی، اُسے سزا مل گئی۔

شام نے کہا۔

"یہ جس حالت میں بھی ہے، اِسے بیلا کے پاس پہنچانا ضروری ہے۔ یہ بیلا کی امانت ہے! اگر یہاں اِسے کچھ ہو گیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ سب یہی کہیں گے کہ میں نے گوپال کو گھر سے بھگایا، اُسے شراب پلا کر ختم کیا۔"

رانی بھی جیسے ویسا ہی چاہتی تھی، اُس نے گوپال کو جھنجھوڑا۔

گوپال نے لڑکھڑائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں ہوش میں ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔!"

رانی نے اُسے چارپائی پر سے اُٹھایا۔

"چلو۔"

اُس نے رانی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کہاں؟"

"بیلا کے پاس۔!"

گوپال سینے پر زور دے کر رُک رُک کہنے لگا۔

"مجھے اپنے گھر لے چلو۔ میری بیلا تم ہو، وہ شام کی بیلا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں۔ میں جانتا ہوں......"

رانی نے اُسے سہارا دیا۔

"اچھا تو میرے گھر چلو۔"

"یہ کس کا گھر ہے ـــ؟"

"شام کا ـــ"

رانی اُسے سہارا دے کر کار تک لے آئی۔ پندرہ بیس منٹ میں ہی اُن کی کار بیلا کنج کے پھاٹک پر تھی، ہوا تھم گئی تھی لیکن بارش اب بھی اُسی زور شور سے ہو رہی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف لگی ہوئی برقی قمقموں کی لڑیاں اُسی آب و تاب سے چمک رہی تھیں۔ برات کے استقبال کیلئے بنایا گیا دروازہ اُسی طرح کھڑا تھا۔ صرف اُسکی سجاوٹ اُکھڑ گئی تھی۔ پھول پتے آندھی میں اُڑ چکے تھے۔ لیکن اُس میں لگائے گئے کیلے کے پیڑ اُسی طرح کھڑے تھے۔ اُن کے لٹکے ہوئے بڑے بڑے پتوں پر گرتے ہوئے بارش کے قطرے کوٹھی کی روشنیوں میں چمک رہے تھے۔ بارش کی آواز کے علاوہ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ بیلا کنج کے لان میں لگا ہوا شامیانہ ابھی تک اُسی طرح گرا ہوا تھا۔ مہمانوں کے قہقہوں اور بینڈ کے شور سے گونجتا ہوا بیلا کنج اِس وقت قبرستان کی طرح خاموش تھا۔ اندر سے قدموں کی دبی آہٹ کے سوا کچھ سُنائی نہ دیتا تھا۔

شام گوپال کے مدہوش جسم کو سہارا دے کر بیلا کے کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن کُھلے ہوئے دروازے کے پاس پہنچ کر رُک گیا۔ اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ ـــ سامنے بیلا لیٹی ہوئی تھی ـــ سفید سی لاش پڑی تھی۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں بار بار اِدھر اُدھر گھومنے لگتیں ـــ مگر جیسے اُن کی بینائی ختم ہو چکی تھی۔ شام گوپال کو لے کر اُس کے قریب گیا ـــ

ایک لمحہ کیلئے بیلا کا رُخ شام۔ گوپال اور رانی کی طرف ہوا۔ وہ ایک لحظہ تک اُن کی طرف گھورتی رہی۔ پھر اپنی بچی کھچی قوت کو جمع کر کے اُٹھ بیٹھی ـــ

ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر بیلا کو جھنجھوڑا۔

"بیلا ـــ! دیکھو کون آیا ہے؟"

شام ڈرتا جھجکتا آگے بڑھا۔

"بیلا!"

—— بیلا خاموشی سے اُس کی طرف دیکھتی رہی ۔ ڈاکٹر نے شام کی مدد کی۔

"اِنہیں پہچانتی ہو؟"۔

بیلا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں شام ہے!"

ڈاکٹر کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آنے لگی۔ شام نے آنسو پینے کی کوشش کی ——

"اِدھر دیکھو، میرے ساتھ کون آیا ہے!"

بیلا پٹ پٹ اُسے دیکھتی رہی۔

شام نے رُک رُک کر اپنی بات جاری رکھی ——

"میرے ساتھ گوپال ہے۔ میں تمہارے گوپال کو لے آیا ہوں"!

گوپال نے پہلی بار سر اُٹھا کر بیلا کی جانب دیکھا۔ جیسے کسی نے اُس کے جسم سے بجلی کا ننگا تار چھوا دیا۔ اُسے ایک زور کا جھٹکا سا لگا —— سارا نشہ ایک دم اُتر گیا وہ جیسے ہڑبڑا کر نیند سے جاگا تھا —— اور بیلا اُس کے سامنے تکیوں کا سہارا لئے بیٹھی تھی۔

بیلا کے ہونٹ کانپنے کا لگے —— مدھم مری ہوئی آواز میں بولی ——

"کہاں ہے گوپال؟"

"یہ دیکھو۔ یہ میرے سامنے کھڑا ہے، کیا تم اسے کبھی بھول گئی ہو —— ؟ کیا تم مجھے کبھی بھول گئی ہو؟" ——

—— لیکن بیلا کو شام نہیں بھولا تھا۔ وہ صرف شام کو پہچان سکتی تھی۔

اُس کی یادداشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ کسی کو نہیں پہچان رہی تھی۔ اس حادثہ سے وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی تھی۔ چاروں طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ جیسے اجنبی لوگوں میں گھر گئی ہو۔

شام نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"سب اپنے ہی لوگ ہیں بیلا! یہ دیکھو، یہ یوگ کھڑا ہے۔ یہ تمھارے پاپا ہیں غور سے دیکھو۔ سب اپنے ہی لوگ ہیں! یہ گوپال ہے!"

— لیکن بیلا کسی کو نہیں پہچانتی تھی۔ یوگ، پیارے لال، گوپال، سبھی اُس کے لئے اجنبی تھے۔ اِن سب میں اگر کوئی اُسے جانتا تھا، جسے وہ پہچان سکتی تھی؛ وہ شام تھا۔ اُس کے علاوہ اُس نے کسی کو پہچاننے سے انکار کر دیا۔ سب بُت بنے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پنڈت پیارے لال اپنے تمام ضبط و تحمل کے باوجود اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکے۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے۔

"ڈاکٹر —!"

ڈاکٹر نے مایوسی سے سر کو جھٹکا —

"صدمہ بہت گہرا ہے! — اس اندھیرے میں صرف شام ہی ایک روشنی کی کرن نظر آتا ہے۔ شاید اُس کی وجہ سے وہ آپ لوگوں کو بھی پہچاننے لگے۔"

سب خاموش سر جھکائے کھڑے تھے۔ — اُن کے چہرے خزاں رسیدہ پتّوں کی طرح بے رنگ و بے آب تھے۔ لاش کی طرح سفید تھے۔

رانی آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے باہر نکل آئی۔ اُس میں یہ روح فرسا منظر دیکھنے کی تاب نہیں تھی۔

— رانی کے باہر جاتے ہی گوپال بھی سر جھکائے باہر نکل گیا۔ اس المیہ کی ساری ذمہ داری اُس پر تھی۔ اُس کی نظریں ندامت کی وجہ سے اُٹھ نہیں رہی تھیں۔ اس طویل وقفہ میں اُس کے مُنہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

گوپال کسی بھی حادثہ کیلئے تیار تھا۔ لیکن اس حادثہ کے نتائج اپنے تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔۔۔۔ لیکن وہ صاف بچ گیا ـــــ اُس کی شکار بیلا ہوگئی ـــــ یہ حادثہ اُس کے لئے بے حد اذیت ناک تھا۔

دونوں کے چلے جانے پر کسی نے توجہ نہ دی۔ کسی کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر بھی بیلا کو ایک اور انجیکشن دے کر چلا گیا۔

ـــــ اور پھر سب بیلا کو اُس کے حال پر چھوڑ کر چلے آئے۔ صرف شام اُس کے بستر کے پاس کھڑا سونے کیلئے کروٹیں بدلتی ہوئی بیلا کو دیکھ رہا تھا ـــــ۔۔۔۔ اگر اُس کا بس چلتا؛ تو وہ اب بھی شام کو دھتکار کر اپنے کمرے سے باہر نکال دیتی۔ لیکن وہ بے بس تھی؛ مجبور تھی ـــــ۔۔۔۔ لیکن صرف چند گھنٹے پہلے۔۔۔۔ صرف چند لمحے پہلے وہ دولہن بن کر اپنے دولہا کا انتظار کر رہی تھی۔۔۔۔ اب اُنہی دھڑکنوں سے اپنی موت کو پکار رہی تھی۔ اور اُس کے سرہانے کھڑا شام سوچ رہا تھا۔۔۔۔ کئی بار مرنے کیلئے جینا پڑتا ہے۔۔۔۔ اور کئی بار جینے کے لئے مرنا پڑتا ہے ـــــ لیکن میں کس کیلئے جی رہا ہوں؟ کس کے لئے مرنا چاہتا ہوں؟

•••

ڈاکٹر کی ہدایت اور خود بیلا کے اصرار پر شام بیلا کے پاس ہی رہنے لگا۔ دن رات بیلا کی دیکھ بھال میں مصروف رہتا، شہر کے بہترین دماغوں سے مشورہ کرتا۔ اور سارا سارا دن بیلا کی چارپائی سے لگا گذار دیتا۔

جب سے بیلا کا دماغی توازن بگڑ اٹھا، وہ ساری دُنیا سے ہی کٹ کر رہ گیا تھا۔ اُسے کچھ خبر نہ تھی کہ بیلا کنج کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ شادی کی خوفناک رات کے بعد اُس نے گوپال کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ وہ نہ جانے کہاں تھا؟ —— کس حالت میں تھا؟؟ —— ...... اس دوران میں رانی دو چار بار بیلا کی عیادت کو آئی تھی۔ مگر اُسے بھی گوپال کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ صرف اتنا بتا سکی کہ گوپال پھر اپنی پُرانی روش پر لوٹ گیا ہے۔ بلکہ اُس کی شراب نوشی پہلے سے بہت بڑھ چکی ہے —— لیکن وہ کہاں ہوگا؟ —— یہ وہ بھی نہ بتا سکی۔ اور شام کے پاس بیلا کی تیمارداری کے بعد اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ گوپال کا پتا کرتا۔

شام کی ان تھک کوششوں اور دن رات کی محنت سے بیلا کی حالت میں فرق آنے لگا تھا ـــ اب وہ اپنے باپ اور بھائی کو پہچان سکتی تھی۔ آہستہ آہستہ اُسکی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں لوٹنے لگی تھیں آہستہ آہستہ اُسکے ذہن کے تمام دریچے کھلنے لگے تھے، اپنی شادی کے نقوش اُسکے دماغ میں اُبھر رہے تھے۔ سب باتیں آہستہ آہستہ یاد آنے لگی تھیں۔ اور شام اُس میں آنے والی اس تبدیلی کو محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اس بات پر مسرت ہو رہی تھی کہ اُس کی مسلسل خدمت نے بیلا کو ذہنی موت سے بچا لیا ہے۔ وہ کھِل سا گیا۔

بیلا بھی شام کی بے پناہ محبت اور خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ رات میں سوتے ہوئے جب بھی اُس کی آنکھ کھلی، اُس نے شام کو اپنے بستر کے پاس آرام کرسی پر بیٹھے دیکھا؛ اُسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔۔۔۔ اپنی صحت یابی پر شام کے اُداس سُتے ہوئے چہرے پر مسرت کی دبی دبی شعاعیں پھوٹتے دیکھتی، تو اُس سے ہمدردی ہونے لگتی۔ اُس کی بے لوث خدمت کو دیکھ دیکھ کر دل میں پریشان ہو اُٹھتی۔ اُس نے آج تک شام کو نظر انداز کیا تھا۔ اُس کی تمام تمناؤں، تمام آرزوؤں کو ناکام حسرتوں میں تبدیل کیا تھا۔ کھُلے بندوں اپنی نفرت کا اظہار کیا تھا۔ اُس کی تذلیل کی تھی ـــ پھر بھی جب بھی اُس کے قدم ڈگمگائے۔ جب بھی اُسے سہارے کی ضرورت ہوئی۔ شام نے آگے بڑھ کر اُسے تھام لیا۔ـــ گوپال سے ملے بیلا کو ایک مُدت ہو گئی تھی۔ معلوم بھی نہ تھا کہ وہ کہاں ہوگا؟

بیلا ابھی تک گوپال کو فراموش نہ کر سکی تھی۔ اُس سے اسی طرح محبت کرتی تھی۔ اُس کے دل میں شام کیلئے اب بھی کوئی محبت نہ تھی ـــ البتہ رحم کا جذبہ بن مٹ رہا تھا۔ وہ سوچتی ـــ کیا ہوا اگر میں شام سے محبت نہیں کر سکتی؟ اُس کو اپنا وہ چاہت نہیں دے سکتی جو ازل ہی سے گوپال کیلئے وقف ہے!۔۔۔۔ لیکن کیا میں شام کی اُجڑی ہوئی آنکھوں میں نور بھی نہیں بھر سکتی؟! کیا میں اُس کی تمام قربانیوں کے پیشِ نظر اُسے مسرت نہیں دے سکتی ـــ ؟!ـــ بیلا کو شام کی افسردگی اور تباہ حالی پر رحم آنے لگتا۔ بیلا کے لئے اب یہ خیال بڑا تکلیف دہ ہونے لگتا کہ

محض اُسی کی وجہ سے وہ اب تک اس وسیع و عریض دنیا میں اکیلا، تنہا بھٹک رہا تھا۔ اسی رحم کے جذبے کے پیش نظر بیلا نے شام کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا ۔۔۔ کہ اپنی نہیں تو کم از کم کسی دوسرے کی زندگی کو سنوارا جائے!۔

۔۔۔ اور ایک دن بیلا نے باتوں ہی باتوں میں ظاہر بھی کر دیا ۔۔۔ شام کے لئے کوئی بات نئی نہ تھی ۔ وہ یہ سب پہلے ہی سے جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بیلا کسی حالت میں بھی گوپال کی محبت کو اپنے سینے سے نہیں نکال سکتی ۔ گوپال اُس کا محبوب ہی نہیں بلکہ معبود ہے ۔ اُسے معلوم تھا کہ بیلا کے لئے گوپال کو چھوڑ کر کسی اور کیلئے پیار کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ پیار ایک ایسی شاخ ہے جس پر صرف ایک ہی پھول کھلتا ہے ۔ جو مرجھانے کے بعد اپنا ابدی تعطّر چھوڑ جاتا ہے ۔۔۔ !!

۔۔۔ شام کو اب یہ خواہش بھی نہیں رہی تھی کہ وہ بیلا کی محبت حاصل کرے ۔۔۔ بیلا اُس کی محبت کا جواب محبت سے دے ۔ اُس کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ بیلا کی محبت کو سینے سے لگائے اپنی زندگی گذار دے ۔ لیکن وہ یہ بھی پسند نہ کرتا تھا کہ بیلا اس مرتبہ صحتیاب ہونے کے بعد اکیلی رہے، اندر ہی اندر گھلتی گھلتی رہے؛ وہ صرف بیلا کیلئے زندہ تھا۔ اور اُسے زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیلا اُس سے پیار نہ بھی کرے۔ لیکن اُس کے پاس رہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے رہے۔۔۔ شاید اس طرح اُس کے غم میں کچھ کمی ہو سکے شاید وہ ۔۔۔۔ ؟!

لیکن شام یہی بات اپنے منہ سے کہنے میں ہچکچا رہا تھا ۔۔۔، جھجک رہا تھا کہ بیلا کہیں اُس کی اس خواہش کا غلط مطلب نہ لے لے ۔ بیلا کی زبان سے اپنے دل کی بات سُن کر وہ خوشی سے اچھل پڑا ۔۔۔ بے اختیار ہو کر بیلا کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور دیر تک چھلکتی ہوئی آنکھوں سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ بیلا کے اس فیصلہ نے اُس کے ذہن سے ایک بھاری بوجھ اُتار دیا تھا ۔۔۔ پیارے لال اور یوگ یہ سُن کر حیران رہ گئے۔ ایک دوسرے

کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے ___

بیلا ایک فیصلہ پر پہنچنے کے بعد بڑی تیزی سے اپنی صحت بحال کر رہی تھی۔ اب وہ خود اِدھر اُدھر چل پھر سکتی تھی۔ اور شام بھی کچھ دیر کیلئے اپنے دفتر یا کلب کا چکر لگا آتا تھا۔

صبح بڑی ہی خوش گوار تھی۔ شام نے دفتر جانے کیلئے لباس تبدیل کیا اور ٹائی کی گرہ ٹھیک کرتا ہوا بیلا کے کمرہ کی طرف چل دیا۔ بیلا آرام کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ دیکھ رہی تھی ___ شام کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

شام نے بدستور ٹائی سے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

"اُب کیسی طبیعت ہے؟"

بیلا نے اُسی طرح مسکراتے ہوئے کہا ___

"تمھیں کیسی لگتی ہوں؟"

"اُب تم بالکل ٹھیک ہو۔ اب شام کو باہر گھومنے جایا کرو ___"

بیلا نے گمبھیر سُر میں پوچھا۔

"کس کے ساتھ؟"

"یوگ ہے۔ پنڈت جی ہیں۔ اور ۔۔ اور میں ہوں تم کسی کے ساتھ بھی گھومنے جا سکتی ہو۔"

بیلا نے آنکھیں موند لیں۔

"میں نے کئی بار سوچا۔ لیکن تمہیں اپنے دفتر سے ہی فرصت نہیں۔ اگر آج جلدی آجاؤ تو ....."

بیلا نے عجیب سی شریر نظروں سے شام کو دیکھا۔

بہت مُدت کے بعد شام کو ایک انوکھی سی مسرت کا احساس ہوا۔ ایسی مسرت،

ایسی خوشی اُس کی زندگی میں پہلی بار آئی تھی۔ بیلا آج پہلی بار اُس کے ساتھ سیر کے لئے جانے کو تیار ہوئی تھی۔ اُس کی ٹائی ٹھیک کرتی رہی تھی۔

شام کا دل دفتر میں نہ لگا۔ اُس کی نگاہیں بار بار گھڑی کی طرف اُٹھ جاتیں؛ وہ بڑی بے تابی سے وقت گذرنے کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن جیسے وقت ہی تھم گیا تھا۔ اپنی صدیوں پرانی چال بھول گیا تھا۔ جیسے گھڑی نے بھی اُس کے خلاف سازش کر رکھی تھی؛ اُس کی سوئیاں بہت ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک ایک لمحہ گذارنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ دفتر کا وقت ختم ہوتے کے بعد بھی گھنٹوں اپنی میز پر جھکا رہتا تھا۔ اپنی فائلوں میں اُلجھا رہتا تھا۔ لیکن آج ..... وہ چاہتا تھا کہ اسی وقت اُڑ کر بیلا کے پاس جا پہنچے۔ اُسے دونوں بازوؤں میں اُٹھالے اور اِسی طرح اُٹھائے اُٹھائے دوڑتا پھرے۔

وہ وقت سے بہت پہلے دفتر سے نکل آیا۔ دیر تک مختلف دوکانوں میں بھٹکتا رہا۔ بیلا اب بالکل ٹھیک ہو چکی تھی۔ چند ہی دنوں میں اُس کے ساتھ ایک ابدی رشتے میں بندھ رہی تھی۔ صرف چند روز، چند لمحے، چند ساعتیں..... اور بیلا.....!

۔۔ بیلا اُس کے سامنے دُلہن بنی بیٹھی تھی۔ سرخ لباس میں بیر بہوٹی سی بنی، سمٹی، سکڑی..... لجائی ہوئی سی! ۔۔ اُس نے تصور ہی تصور میں اُسے وہ تمام کپڑے پہنا ڈالے جو اُس کی موٹر کی پچھلی نشست پر ڈھیر تھے!..... بیلا کا مسکراتا ہوا چہرہ..... اُس کے پتلے پتلے سُرخ یاقوتی ہونٹ..... موٹی موٹی غلافی آنکھوں پر جھکی جھکی سی پلکیں..... بیلا کا ملکوتی حُسن لئے ہوئے جسم ۔۔!!.....

بیلا کا مرمریں گداز پیکر اُس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا اُسے بُلا رہا تھا ۔۔ اُسے اپنی سرپٹ بھاگتی ہوئی کار کی رفتار بڑی سُست سی لگنے لگی۔ اپنے دائیں بائیں، آگے پیچھے چلتی ہوئی گاڑیاں اُسے رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اُن تمام لوگوں پر غصہ آنے لگا جو سڑکوں پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُس کا جی چاہا کہ ان تمام لوگوں کو، ان تمام موٹروں، بسوں، تانگوں کو

اُٹھا کر کہیں دور پٹخ دے ..... یہ خود ہی کہیں غائب ہو جائیں! — کم از کم وہ راستے ہی خالی کر دیں جو بیلا کے پاس جاتے ہیں۔ اُس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھا دیا۔ کار ایک جھٹکے کے ساتھ پوری رفتار سے دوڑنے لگی —

ایک طویل چیخ کے ساتھ کار گھسٹتی ہوئی بیلا کنج کے پھاٹک پر جا کر رُک گئی۔ شام جلدی سے باہر نکلا۔ بنڈلوں اور ڈبوں کو دونوں بازوؤں پر لاد کر تیز قدموں سے بیلا کے کمرے کی طرف چل دیا — دھڑکتے ہوئے دل سے بیلا کے کمرے میں پہنچا۔ بیلا وہاں نہ تھی۔ اُس نے ساری چیزیں میز پر رکھ دیں۔ اور ڈرائنگ روم کی طرف دوڑا — بیلا اُس کا انتظار کر رہی ہے .... اُس کی راہ دیکھ رہی ہے —' یہ خیال ہی اُسے تمام دُنیا کی مسرتیں دینے کے لیئے کافی تھا —

اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈرائنگ روم کے دروازہ کا پردہ سرکایا — اور اندر داخل ہو گیا، بیلا واقعی اُس کا انتظار کر رہی تھی — شام اُسے کلائی سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اُس کے کمرے میں لے گیا۔ بیلا اُس کے والہانہ پن پر مسکرانے لگی۔ مسکراتی ہوئی اُس کے ساتھ چلتی رہی — کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر اُن تحفوں پر پڑی۔ جو بے ترتیبی سے میز پر پڑے ہوئے تھے۔ مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

شام ایک ایک ڈبہ، ایک ایک پیکیٹ کھول کھول کر اُس کی گود میں ڈالنے لگا — قیمتی ساڑھیاں تھیں۔ بیش قیمت زیور، جن میں شام کا اپنا بے بہا خلوص جھانک رہا تھا — اُس کا بے لوث دل دھڑک رہا تھا۔

شام نے ایک بھڑکدار سُرخ ساڑھی چُنی اور اُس کی طرف بڑھا دی۔

"یہ ساڑھی باندھو —!"

بیلا اُس کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی — پھر مسکراتی ہوئی لباس تبدیل کرنے کیلئے ساتھ کے کمرے میں چلی گئی —

سُرخ ساڑھی میں اُس کا حُسن اور بھی نکھر آیا۔ شام نے ایک جڑاؤ ہار نکالا۔
اور بیلا کے گلے میں پہنانے لگا ــــ
"آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے سجاؤں گا ــ اپنے ہاتھوں سے تمہیں دولہن
بناؤں گا ــــ"
بیلا کی آنکھوں میں شرارت ناچی ــــ
"دولہن بن گئی۔ لیکن دولہا نہ آیا۔ تو .... ؟"
شام کی آنکھوں کے سامنے دوبارہ بھولا بسرا منظر گھوم گیا۔
"پہلے تمہیں کسی دوسرے کے ہاتھوں نے دولہن بنایا تھا۔ اب میرے ہاتھوں نے
اب کی بار تمہارا دولہا ضرور آئے گا ــ اور تمہیں ...."
شام نے اپنی بات پوری نہ کی۔ زیورات کے ڈبے کھولنے لگا ــ انگوٹھیاں،
آویزے۔ چوڑیاں .... نہ جانے کیا کیا نکال نکال کر اُسے پہناتا رہا۔ بیلا مسکراتی ہوئی
ایک ایک چیز پہنتی رہی ــ شام نے اپنے ہاتھوں سے اُس کے ماتھے پر بندیا لگائی،
افشاں چُنی، چھوٹی سی ہیرے کی کیل اُس کی ناک میں پہنائی۔ اور اُس کی طرف دیکھنے لگا ــ
ــ بیلا سچ مچ دولہن لگ رہی تھی ــ
مسکراتی ہوئی بولی ــ
"مجھے تو دولہن بنا دیا ــ کیا تم دولہا نہیں بنو گے ؟"
شام کا دل کانپا ــ
"لیکن تمہیں تو مجھ سے پیار نہیں ــ !"
بیلا شرما گئی۔
"یہ ضروری بھی تو نہیں کہ شادی سے پہلے ایک دوسرے سے پیار کیا جائے۔
حقیقی پیار تو شادی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے ــ"

شام نے دولہن کی آنکھوں میں دیکھا — پیار کی لرزشیں نہ تھیں۔ لیکن نفرت بھی کہیں نہ تھی۔ وہ اپنے کانپتے ہوئے دل کو سنبھالتا اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔

— بھولو چاچا برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھا اُس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا — شام نے اُسے دیکھا تو دوڑتا ہوا اُس کے پاس جا پہنچا —

"آؤ بھولو چاچا —!"

بھولو چاچا اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اُس کے پیچھے چلدیا۔ شام نے اُس کی طرف کپڑوں کا نیا جوڑا بڑھایا —

"بھولو چاچا! جب بیٹے کی شادی ہوتی ہے نا — تو باپ بھی دولہے کی طرح ہی سجتا ہے۔ اور تم میرے ....."

بھولو چاچا کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ کچھ نہ جانتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ گیا — شام کو اپنی محبت مل گئی۔ بھولو چاچا کو اپنا مستقبل مل گیا — وہ اپنی زندگی سے صرف اس لئے پیار کرتا تھا۔ وہ صرف اس لیے زندہ تھا کہ اُسے شام کی زندگی پیاری تھی۔ اُسے شام کی محبت پیاری تھی — شام کی خوش آئند دُنیا پیاری تھی۔ وہ صرف شام کے لئے زندہ تھا — اُسے اپنی کھوئی ہوئی دُنیا مل گئی — وہ اس نئے لباس میں کسی وقت بھی موت کا سواگت کر سکتا تھا۔

شام نے کپڑے بدلے۔ نیا سوٹ پہنا اور ٹائی سے کھیلتا ہوا بیلا کے کمرے کے پاس جا پہنچا — بیلا سُرخ لباس میں لپٹی ہوئی بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ لیکن اُس پر نظر پڑتے ہی شام کے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم رُک گئے — آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ بیلا پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی: اور اُس کے پاس ہی گوپال لیٹا ہوا تھا — شراب میں مدہوش! — بیلا اُس کا سر اپنی گود میں رکھے اُس کے خشک

اُلجھے ہوئے بالوں میں اُنگلیاں پھیر رہی تھی ــــ اُس کی آنکھوں سے گرتے ہوئے شبنم کے قطرے گوپال کے زرد مدقوق چہرے کو دھو رہے تھے ــــ

بیلا کو معلوم بھی نہ ہوا کہ دروازہ میں پتھر کا بُت بن کر کھڑا کوئی اُسے حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اُس کے بہتے ہوئے آنسوؤں میں اپنی تمام نوزائیدہ مسرتوں اور اُمنگوں کو بہتے دیکھ رہا ہے۔

شام نہ جانے کب تک اِسی طرح کھڑا دونوں کی طرف دیکھتا رہا۔ نہ جانے کب تک اپنی زندگی کے ریگستان میں ایک دم نظر آجانے والے اس دریا پر آنسو بہاتا رہا جو اُسکے نزدیک پہنچتے ہی غائب ہو گیا تھا؛ پھر ریت ہی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جو کچھ بھی نہ تھا۔ محض سراب تھا۔ نظر کا دھوکا تھا! ــــ!!

اُس کے سامنے گوپال لیٹا ہوا تھا۔ جو بیلا سے کی ہوئی آخری ناانصافی اور بے وفائی کے صدمہ کو اب تک شراب میں ڈبونے کی کوشش کرتا رہا تھا ــــ اور ناکام ہو کر اپنے جرم کی تلافی کرنے کیلئے اُسی شراب کا سہارا لئے گرتا پڑتا، بیلا کنج آپہنچا تھا ــــ اُس کے سہانے سپنوں کو، خوابوں کی دُنیا میں چلنے والے آشاؤں کے قافلے کو لوٹنے کے لئے ــــ ....!! ــــ

شام کے ڈھندلکے رات کے اندھیروں میں گم ہو رہے تھے۔ گوپال نے کروٹ بدلی ــــ بیلا کی نظریں اچانک دروازہ سے آٹکرائیں۔ شام اب تک وہیں کھڑا تھا ــــ بے اختیار ہو کر بولی ــــ

شام! گوپال آگیا ــــ"

شام نے اپنے آپ کو سنبھالا ــــ بمشکل آواز نکالی ــــ

"مجھے معلوم تھا۔ ایک دن ضرور آئے گا ــــ لیکن اب اُسے بھاگنے نہ دینا ــــ!"

بیلا غیر اختیاری طور پر اُس کی طرف لپکی۔ لیکن شام بیلا کنج سے باہر نکل گیا تھا۔

شام ابھی سیلا کنج کے پھاٹک کے باہر ہی کھڑا تھا کہ ایک ٹیکسی اُس کے پاس آکر رُکی۔ پچھلا دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھُلا اور رانی گھبرائی ہوئی سی باہر نکلی — شام نے پھاٹک بند کر دیا۔ اور رانی کی طرف دیکھنے لگا — !

رانی نے اُس کی سُرخ سوجی ہوئی آنکھوں میں جھانکا — اور ایک دم سہم سی گئی۔ جھجکتے ہوئے بولی —

"گوپال ..... "

شام نے اُسے فقرہ مکمل نہ کرنے دیا — بازو سے پکڑ کر بولا —

"آؤ میرے ساتھ —"

رانی کچھ نہ سمجھ سکی — حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی —

لیکن گوپال ؟"—

وہ صبح سے اُس کیلئے ماری ماری پھر رہی تھی۔ گوپال کئی روز سے غائب تھا۔ وہ اُس کیلئے پریشان ہو رہی تھی —

شام نے پھر اُس کی بات کاٹ دی۔

"گوپال سیلا کے پاس بیٹھا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ دوبار کھو چکنے کے بعد اب وہ کافی محتاط ہو گئی ہو گی — اب وہ اُسے بھاگنے نہیں دے گی — اور شاید اب وہ بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا —" اب یہاں ہم دونوں کی ضرورت نہیں! —"

رانی اپنے آنسو پونچھتی ٹیکسی میں بیٹھ گئی — شام اُس کے ساتھ جا بیٹھا۔ ٹیکسی چل پڑی۔

رانی حالات کی اس تبدیلی کیلئے بالکل تیار نہ تھی — اُس کیلئے اپنے آپ کو اس طرح ایک دم نئے سانچے میں ڈھال لینا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ حیران تھی

کہ کیا کرے ۔۔۔ ؟ ۔۔۔۔ گوپال پھر سیلا کے پاس جا پہنچا تھا ۔ اُسے اپنی زندگی ایک دم خالی خالی سی لگنے لگی ۔ ٹیکسی میں مکمل خاموشی تھی ۔۔۔ رانی سے ضبط نہ ہو سکا ۔

"لیکن میں ۔۔۔ ۔۔۔۔"

"تمہیں خوش ہونا چاہیئے کہ تمھارے گوپال کو ایک حسین ترین زندگی مل گئی ۔ مجھے خوش ہونا چاہیئے کہ میری محبت کو اپنی منزل گئی ۔۔۔۔ کتنی بڑی خوش قسمتی ہے ۔ کتنی بڑی بد قسمتی ہے ! ۔۔۔"

رانی نے روتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا ۔ شام نے اُس کا سر اپنے کندھے سے لگاتے ہوئے کہا ۔

"ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں ۔۔۔ ایک ہی سفر کے راہی ہیں ۔۔۔ ہماری کوئی منزل نہیں ۔ کوئی کنارہ نہیں ۔۔۔ جو بس چلتے رہتے ہیں ۔۔۔ صرف خواب دیکھ سکتے ہیں ۔۔۔ ۔۔۔ جو کبھی سچ نہیں نکلتے ۔۔۔ بے منزل کے قافلوں کی طرح کبھی منزل پر نہیں پہنچتے ۔۔۔"

"میں کیا کروں ۔۔۔ ؟" رانی نے سسکیاں لیتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے بات کی ۔۔۔

شام کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے ۔۔۔۔۔

"ہمیں اسی طرح انہیں راہوں پر چلتے رہنا ہے رانی ! ۔ شاید کسی وقت ۔۔۔ کسی دن ۔۔۔ کسی پڑاؤ پر ہمیں اپنے اپنے ساتھی مل جائیں ۔۔۔ شاید اُنھیں پھر ۔۔۔ کہیں نہ کہیں ۔۔۔ کسی نہ کسی وقت ہماری ضرورت پڑ جائے ! ۔۔۔۔ تمھارا گوپال تمہیں مل جائے ! ۔۔۔ میری سیلا پھر چند لمحوں کیلئے میرے نزدیک سے گزرے ، اُسے منزل تک پہنچانے کیلئے پھر سہارا دینا پڑے ۔ اور پھر ۔۔۔۔"

شام کی آواز گلے میں ہی پھنس کر رہ گئی۔ روتے روتے رانی کی ہچکی بندھ گئی تھی؛
اُس نے رانی کا سر سہلاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"ہمیں جینا ہے رانی! اپنے لئے نہیں، بیلا کیلئے ... گوپال کیلئے!
.... ہمارے اپنے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہونگے ـــ یہ ہمیشہ اسی طرح قافلہ در قافلہ بے آب و گیاہ ریگستانوں میں بھٹکتے پھریں گے ـــ کہ دوسروں کی رہنمائی کر سکیں ـــ اُن کی اپنی کوئی منزل نہیں ـــ!"

رانی نے اُس کی طرف دیکھا۔

"بیلا کنج میں تمہاری اپنی کوئی چیز نہیں تھی؟ ـــ تم نے اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لیا ـــ!"

"ایک چیز تھی ـــ"

"کیا ـــ؟"

"بھولو چاچا! ـــ"

"اُسے اپنے ساتھ لے چلتے ـــ"

"بھولو چاچا میری زندگی کا پہرہ دار ہے ـــ محافظ ہے ..... میری زندگی بیلا کنج میں ہی رہ گئی ـــ اُسے بھی وہیں رہنا چاہئے ـــ میری زندگی کی رکھوالی کیلئے ـــ ایک سپاہی بن کر، ایک محافظ بن کر!"

"اب تم کہاں جاؤ گے ـــ؟"

شام نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنی کہی۔

"اب ہم دونوں اکٹھے رہیں گے ـــ بغیر کسی رشتے کے ـــ بغیر کسی بندھن، کسی محبت کے! ـــ صرف دوست بن کر ـــ ساتھی بن کر ـــ اب ہمیں صرف مرنے کیلئے زندہ رہنا ہے ـــ!"

رانی نے اُس کی چھلکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا ———

"تمھارا مطلب ہے ......"

"رانی! یہ بھی جینے کا ایک حسین ترین انداز ہے۔ مرنے کا یہ بھی ایک گھناؤنا ڈھنگ ہے ——!! بہر حال ہم زندہ رہیں گے۔ مطمئن رہو ——!"

رانی نے اپنا سر اُس کے سینے سے لگا لیا ———

——— ختم ———

کرشن کاشمیری

کا

نیا ناول

رات اور زلف

قیمت

تین روپے